فرد

شمارہ نمبر ۷ مئی ۲۰۱۴ء

انڈویجوئل لینڈ
انفرادی آزادی کے لئے کوشاں

Friedrich Naumann STIFTUNG FÜR DIE FREIHEIT
کے تعاون سے

فرد

شمارہ نمبر ۷ مئی ۲۰۱۴ء

ایڈیٹر:
سندس سیدہ

کوارڈینیشن: اویس محمود
سید فہد الحسن

کارٹونسٹ:
فاروق قیصر

ڈیزائین
عدیل امجد، ڈاٹ لائنز

پبلشر:
انڈویجوئل لینڈ پاکستان

آئی ایس بی این ۵ ۲۹ ۹۵۸۲ ۹۶۹ ۹۷۸

فہرست

ایڈیٹر کی میز سے _____ ۱
آرٹ آف فائر _____ ۲
میڈیا اور انتہا پسندی _____ ۵
صحافیوں کے ساتھ تربیتی نشستیں _____ ۱۰
سبز ہلالی پرچم _____ ۱۳
ملٹرزم اور تخریب کا بیانیہ اور نشانات _____ ۱۵
اسلامی نظریاتی کونسل _____ ۱۸
سٹرجیکل سٹرائیکس، این آئی ایس پی اور پاکستان کا امیج _____ ۲۰
اشتہارات اور خواتین _____ ۲۴
ایک مسجد سب کے لئے _____ ۲۷

Individualland
Creating space for the individual
نمبر ۱۲۔بی، سٹریٹ نمبر ۲۶، سیکٹر ایف ۸/۱، اسلام آباد

Friedrich Naumann STIFTUNG FÜR DIE FREIHEIT
کے تعاون سے

ایڈیٹر کی میز سے

پیارے قارئین!

"لاڑکانہ جیل میں قیدیوں نے پانچ پولیس والوں کو یرغمال بنالیا"۔ٹیکنالوجی کی ایک ایجاد سے خبر سنتے ہی میں نے جلدی سے دوسری ٹیکنالوجی کو استعمال میں لاتے ہوئے صوبہ سندھ کے شہر لاڑکانہ میں رہنے والوں کی خیریت دریافت کرنے کے لیے نمبر ملایا۔صورتحال کیا ہے؟ وہاں پر کیا ہورہا ہے؟ لگے ہاتھوں یہ بھی تصدیق کرڈالی کہ آخر میڈیا پر دیکھایا جانے والا کتنا سچ ہے۔اب میں کبھی لاڑکانہ کے حوالے سے آنے والی شہ سرخیوں پر نگاہ دوڑاتی اور کبھی وہاں پر رہنے والوں سے کی گئی بات چیت ذہن میں لاتی۔ہم ایک صارف کی حیثیت سے یہ جاننا چاہتے ہیں کہ میڈیا ہمیں جو دیکھا رہا ہے کیا اس کی حقیقت بھی وہ ہی ہے جو نظر آرہی ہے؟ یہ ہی وجہ تھی کہ میں نے خبر کی حقیقت جاننے کے لیے اپنے رشتے داروں کو فون کیا۔یہ تو محض ایک خبر تھی لیکن یہ حقیقت ہے کہ مختلف خبریں ہمارے رویے، خیالات اور احساسات بدل کر رکھ دیتی ہیں۔

محترمہ بے نظیر بھٹو شہید پر ہونے والے قاتلانہ حملے کے بعد کی خبریں دیکھ لیں جس کی بدولت ملک کے قیمتی اثاثوں کے ساتھ ساتھ لوگوں کی نجی پراپرٹی بھی تباہ ہوگئی، حامد میر پر قاتلانہ حملے کی خبر جس کو سن کر تمام ٹیلی ویژن چینلز ایک ہی قطار میں دوڑتے نظر آرہے ہیں۔حال ہی میں حامد میر پر ہونے والے حملے کے بعد کیے جانے والے پروگرام آپ نے بھی دیکھے ہیں میرا سوال ہے کہ ہمارے اینکرز کتنے غیر جانبدار رہے؟ کس ذمہ داری کے ساتھ انہوں نے اس رپورٹ اور تبصروں کو عوام کے سامنے پیش کیا؟ یہ تمام واقعات، خبریں، تبصرے عوام کی زندگی میں بہت اہمیت رکھتے ہیں، آپ کے خیال میں شاید وہ ایک عام شخص کے لیے اہمیت نہ رکھتے ہوں لیکن میرے خیال میں اگر کسی کی نجی پراپرٹی کو نقصان ہوتا ہے اور وہاں کام کرنے والے لوگ بے روزگار ہوجاتے ہیں تو اس کا ذمہ دار بھی وہ شخص یا ادارہ ہے جس کی بدولت کوئی واقعہ رونما ہوتا ہے۔

اگر میں یہ کہوں کہ میڈیا ہمارے رویوں کو تبدیل کرنے اور ہمیں اشتعال دلانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا۔ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم اس دور میں رہ رہے ہیں جہاں ہمارے پاس بے شمار پسند اور ناپسند کے مواقع موجود ہیں لیکن ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہمیں سیدھی راہ دیکھانے والے بہت کم لوگ ہیں، ہماری کم فہمی اور ناسمجھی کو ہر کوئی اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتا ہے۔یہ ہی وجہ ہے کہ ہمارے نوجوان شر پسند تنظیموں اور لوگوں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن جاتے ہیں اور میڈیا پر آنے والی ایک خبر یا تبصرے کی صورت میں اشتعال انگیزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ملک کے قیمتی اثاثوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔

اس شمارے میں آزاد اور خودمختار میڈیا کے مختلف پہلو کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مختلف آرٹیکلز میں ایک صارف کی حیثیت سے رائے بھی دی گئی کہ میڈیا کو کس طرح ذمہ دار اور غیر جانب دار رہنا چاہئے۔کس طرح میڈیا کی آزادی، جانبداری اور ذمہ داری عام لوگوں کی معاشرتی زندگیوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔میڈیا کے ہماری معاشرتی زندگی پر اثرات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے آرٹیکلز لکھے گئے، اس کے علاوہ ملک میں ہونے والی ان کاوشوں کا بھی ذکر کیا گیا جو ایک پرامن اور تعاصب سے پاک معاشرتی زندگی کی جانب راہنمائی کرتی ہیں۔عوام کے ساتھ ساتھ میڈیا کا آزاد اور خودمختار ہونے کے ساتھ ساتھ ذمہ دار اور غیر جانب دار ہونا کتنا ضروری ہے؟ آرٹیکلز پڑھیے اور اپنی رائے سے آگاہ کرتے رہیئے گا۔

اگلے شمارے تک اجازت دیجئے

سندس سیدہ

آرٹ آف فائر

خرم سلیم

۱۴ فروری ۲۰۱۴ء کو ایک نجی ٹیلی ویژن چینل دنیا نیوز پر "کیوں" کے نام سے ایک پروگرام نشر ہوا جس کی میزبانی کے فرائض ارشد شریف صاحب نے انجام دیئے۔ اس پروگرام کا موضوع پاکستان میں کام کرنے والے غیر سرکاری، غیر منافع بخش تنظیموں کے پیچھے بین الاقوامی خفیہ ایجنسیوں کے ایجنڈے کو بے نقاب کرنا تھا۔ یہ خاص طور پر ان لوگوں کے لیے ایک نہایت دلچسپ موضوع تھا، جو یہ سمجھتے ہیں، کہ کوئی بھی ملک محض لوگوں کی مدد کرنے کی خاطر، خطیر رقم خرچ کر سکتا ہے۔ اس پروگرام میں مختلف بین الاقوامی غیر سرکاری تنظیموں کے مہمان مدعو کیے گئے تھے، جن میں سے ایک صاحب آرٹ آف لیونگ فاؤنڈیشن کے بھی تھے۔ میں یہاں آرٹ آف لیونگ کی طرفداری تو نہیں کر رہا، لیکن اتنا ضرور بتانا چاہوں گا، کہ میں نے ان کے بہت سے کورسز میں حصہ لیا ہے۔ اس کے علاوہ میرے چند دوست بھی ان کے ساتھ کام کر چکے ہیں۔ میں آپ کو آرٹ آف لیونگ کے بارے میں بتاتا چلوں۔ اس کی عمارت بنی گالا میں ہے، جہاں کی پرسکون فضاء فرحت بخش ہے۔ یہاں آپ ہوا میں کھنکتی گھنٹیوں کی آواز سن سکتے ہیں۔ یہاں واقع خوبصورت جھیل دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

آرٹ آف لیونگ میں ذہنی اور جسمانی صحت کو فروغ دینے والے پروگرام منعقد کرائے جاتے ہیں، اور یہ سب کے لیے کھلا رہتا ہے۔ اس کی وسعت تر و تازگی بخشتی ہے۔ سانس لینے کی مشقوں اور یوگا کے ذریعے مثبت سوچ کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ ضرورت مند افراد کی مدد کرنے والے لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ ۲۰۰۵ء کے زلزلے کی تباہ حالی کے بعد انہوں نے بحالی کے لیے فعال کردار ادا کیا تھا۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے معاشرتی فلاحی کاموں میں آرٹ آف لیونگ اہم کردار ادا کر چکا ہے۔

بات ہو رہی تھی ٹیلی ویژن کے پروگرام کی۔ میزبان نے چند تصاویر دکھائیں، جن میں لوگوں کو یوگا کرتے ہوئے دکھایا گیا۔ ان تصاویر پر تبصرہ کرتے ہوئے اس نے نہایت درست الفاظ کا استعمال کیا۔ ایک تصویر، جس میں لوگ یوگا کے ایک مخصوص انداز، جس کا نام "چائلڈ پوز" ہے، میں بیٹھے دکھائی دے رہے تھے۔ تصاویر دکھاتے ہوئے میزبان نے اس پوز پر کافی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ مجھے وہ تصویر تو نہیں مل سکی جو میزبان نے پروگرام میں دکھائی تھی، میرے خیال میں یہ ایک عام پوز ہے۔ جانے کیوں میزبان اس پوز پر اتنا برہم نظر آ رہا تھا؟

آرٹ آف لیونگ کے نمائندے کے ساتھ فاؤنڈیشن کے بانی، شری روی شنکر کی تصویر دکھاتے ہوئے، ایک مشہور شخصیت انصار عباسی صاحب کو متعارف کروایا اور ان سے ایک سوال پوچھا کہ "کیا مسکراہٹیں بکھیرنا ہماری قومی سلامتی کے لیے خطرہ نہیں ہیں؟ کیا اس کے پیچھے بھارت کے ایک خفیہ ادارے کا ہاتھ ہے؟ روی شنکر صاحب نے ۱۵۲ ممالک میں آرٹ آف لیونگ قائم کیے۔ ان کے ممبران کی تعداد لاکھوں میں ہے۔ اس ادارے کا مقصد دنیا میں امن کا فروغ ہے۔ روی شنکر صاحب آرٹ آف لیونگ کے تمام کورس خود بناتے ہیں۔ شنکر صاحب نوبل امن انعام کے لیے بھی نامزد ہوئے۔

مجھے اس دن سے ڈر لگتا ہے، جب لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹیں بکھیرنا، قومی سلامتی کے لیے خطرہ بن جائے۔ ممکن ہے کہ چند خفیہ ایجنسیاں اپنے مفاد کے لیے غیر سرکاری اداروں کو فنڈز دے رہی ہوں۔ لیکن جب تک اس کے واضح ثبوت موجود نہ ہوں، یہ محض قیاس آرائی ہے۔ جانتے بوجھتے ہوئے، کہ آج ل ہمارے ملک میں بنیاد پرستی اور دہشتگردی کی آگ عام ہو چکی ہے، ہم اس آگ پر قیاس آرائیوں کا تیل چھڑکیں گے تو یہ آگ ملک کے کسی ایک حصے تک محدود نہیں رہے گی، بلکہ پورا ملک اس کی لپیٹ میں آ جائے گا۔ خاص طور پر ان لوگوں کے خاندانوں کا اس آگ کی لپیٹ میں آ جانے کا خدشہ ہے، جن کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کی گئیں۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ نہایت غیر ذمہ داری کا ثبوت دیتے ہوئے، میزبان نے لوگوں کی یوگا کرتے تصاویر دکھائیں۔ اگر تصاویر دکھانا اتنا ہی ضروری تھا، تو اُصول رازداری کے لیے تصاویر کو دھندلا کر کے دکھایا جاتا۔ جہاں تک میں آرٹ آف لیونگ فاؤنڈیشن کے بارے میں جانتا ہوں، وہ کسی ادارے سے فنڈز نہیں لیتے۔ ان کی یوگا اور سانس لینے کی مشقوں کی متعین فیس ہے، جو کہ سماجی بہبود کے منصوبوں پر استعمال کی جاتی ہے۔ یہاں پر زیادہ تر کام کرنے

والے لوگ رضا کار ہیں۔ جن لوگوں کو تنخواہ دی جاتی ہے، وہ استاد کی اپنی جیب سے جاتی ہے۔ پاکستان میں آرٹ آف لیونگ کے ممبران کی تعداد آٹھ ہزار کے لگ بھگ ہے۔ داڑھی والے لوگ، شلوار قمیض والے، پینٹ شرٹ والے، خواتین نقاب پوش ہوں یا آزاد خیال، ہر طرح کے لوگ اس کے ممبران میں شامل ہیں۔

شری روی شنکر نے ۲۰۱۳ء میں پاکستان کا دورہ کیا تھا۔ تب ہی انہوں نے یہاں آرٹ آف لیونگ موومنٹ کا افتتاح کیا تھا۔ انہوں نے خطے میں امن کے قیام کے لئے طالبان سے مذاکرت کی پیشکش بھی کی تھی۔ ان کے خیال میں مختلف خیالات کے لوگوں سے مذاکرات کے ذریعے دین کو فروغ دینے میں مدد ملتی ہے۔ شنکر صاحب کا کہنا تھا کہ "میں طالبان سے بات کرنے کو تیار ہوں، میں ان سے بات کرنا چاہتا ہوں، ان کو سمجھنا چاہتا ہوں اور اپنی رائے دینا چاہتا ہوں۔ تاکہ ہم یقینی طور پر واضح فرق دیکھ سکیں، ہمیں اس کے لیے بار بار کوشش کرنی چاہیئے ہمیں یہ کوشش سو بار بھی کرنی پڑے"۔

آٹھ مارچ ۲۰۱۴ء کو، آٹھ افراد آرٹ آف لیونگ سنٹر میں داخل ہوئے۔ وہاں پر موجود محافظوں کو باندھا۔ اُن سے موبائل فون لینے کے بعد ان کے سروں پر وار کیا۔ بے قصور، محنتی پشتون محافظ، جن کی زندگیوں میں جانے کتنے مسائل ہوں گے، اس حملے سے دہشت زدہ ہو گئے۔ ان آٹھ افراد نے وہاں کے تین کمروں کو آگ لگا دی۔ ابھی وہ ایک کمرے پر تیل ڈال ہی رہے تھے، کہ ہمسائے نے دیکھ لیا۔ یہ بتانے کے لیے وہ دوسرے پڑوسی کی جانب بھاگا۔ تب ہی یہ آٹھ بزدل افراد ایک سفید رنگ کی کرولا پر فرار ہو گئے۔ مجھے امید ہے کہ اس بھیانک حملے کے مجرموں کو گرفتار کر کے سزا دی جائے گی۔

یہ مرکز محترمہ شہناز من اللہ کی ملکیت ہے، جنہوں نے اپنی زندگی کے قیمتی دس سال اس سنٹر کو خوب سے خوب تر بنانے میں لگا دیئے۔ ان کا کمرہ جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ ان کے کمرے میں بیڈ، ٹیبل اور لیمپ تو نہیں تھا۔ لیکن ایک تکیہ، چند پینٹنگز اور کتابیں ضرور تھیں۔ وہ زمین پر ہی سوتیں تھیں۔ شہناز من اللہ کا شجرہ کاکا خیل صوفی سلسلے سے ملتا ہے۔ وہ روحانی فطرت کی مالک ہیں۔ اس حادثے کے بعد لوگوں نے اسی ٹیلی ویژن پروگرام کی جانب اشارہ کیا، کہ یہ سب یقیناً اسی پروگرام میں نفرت انگیز گفتگو کا ہی نتیجہ ہے۔ جس کی وجہ سے شدت پسند عناصر اشتعال میں آئے اور یہ واقعہ رونما ہوا۔ میں اس پروگرام کو اس واقعے کا ذمہ دار ٹھہراتا ہوں۔ کیونکہ میزبان نے بغیر تصدیق کے بین الاقوامی غیر سرکاری ادارے پر الزام لگایا، کہ یہ ادارہ بھارت کی ایک خفیہ ایجنسی، جس کے بارے میں سبھی جانتے ہیں کے مالی تعاون سے چل رہا ہے۔

میری اس پروگرام کے میزبان محترم ارشد صاحب سے درخواست ہے کہ جناب بہت مہربانی ہوگی کہ آپ انسانیت کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے، کسی پر بھی الزام تب عائد کریں، جب آپ کے پاس کوئی واضح ثبوت موجود ہوں۔ تاکہ انتہا پسند کسی کی نجی املاک نہ جلائیں۔ جن دو محافظوں جن کو دہشت زدہ کیا گیا اور ان کے سروں پر وار کیا گیا، ان کا کوئی قصور نہیں تھا۔ شہناز کی کئی سالوں کی محنت پر پانی پھر گیا۔ یہ باتیں شاید شدت پسندوں کو تو سمجھ نہ آئیں، لیکن جناب میں آپ سے یہ ضرور کہنا چاہوں گا، کہ کچھ موضوعات ایسے بھی ہوتے ہیں، جن پر بات کرتے ہوئے ذمہ داری کا مظاہرہ کرنا چاہیئے۔ آپ چاہے جتنے سوالات داغیں، ایک صحافی کی حیثیت سے اس بات کو مدِ نظر ضرور رکھیں، کہ ٹیلی ویژن پروگرام کرتے ہوئے آپ کو اپنی رائے نہیں دینی چاہیئے۔۔ آپ آرٹ آف لیونگ فاؤنڈیشن کے خلاف تحقیق کرنے کی آزادی رکھتے ہیں، لیکن میرا آپ کو ایک مخلصانہ مشورہ ہے کہ آپ بھی ان کے ایک کورس میں داخلہ لیں۔ اس کورس کی وجہ سے مجھے بھی بے خوابی اور پریشانی سے چھٹکارا حاصل ہوا ہے۔ میں ان لوگوں کو بھی جانتا ہوں جنہوں نے ان کورسز کی مدد سے دانتوں سے ناخن کترنے، سگرٹ نوشی اور بہت سی معاشرتی بیماریوں سے چھٹکارا حاصل کیا ہے اور مثبت رویے اپنانے کی جانب گامزن ہوئے۔ ارشد صاحب، اگر آپ بھی کسی کورس میں حصہ لے کر آرٹ آف لیونگ سیکھ ہی لیں تو بہتر ہوگا۔

مصنف انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں پروگرام آفیسر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔
میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے:
info@individualland.com

میڈیا اور انتہا پسندی

اکرام ہوتی

حالیہ برسوں میں ایک سوال اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ وہ یہ کہ کیا پاکستانی میڈیا کے ایک وسیع حلقے نے انتہا پسندی اور تخریبی سرگرمیوں کے فروغ میں کوئی بڑا مفاد تلاش کر لیا ہے؟ کیا یہ مفاد اسی نوعیت کا ہے جیسا کہ ریاست کے کچھ عناصر کا، تخریبی نیٹ ورکس کا، چند مذہبی تنظیموں کا اور تخریب کے پشت پناہوں کا ہے؟ تخریبی قوتوں کے تجزیاتی عمل میں یہ ایک قدرے نیا موضوع ہے۔ اسی لئے اولین کاوشوں میں تجزیہ کاروں کو زیادہ ریفرنس مواد دستیاب ہونے کی امید نہیں۔ تاہم چند اشارے ایسے موجود ہیں جن پر ذرا گہری نظر ڈالی جائے، تو یہ افسوسناک حقیقت سامنے آتی ہے کہ ۱۹۷۸ تا ۲۰۱۴ یعنی افغان جہاد کے سالوں سے لے کر گزشتہ ایک دہائی میں، پاکستانی میڈیا کا عمومی کردار کچھ زیادہ قابل توصیف نہیں رہا۔

جن اشاروں کی میں بات کر رہا ہوں، وہ کچھ یوں ہیں:۔

- ریاست اور اس کے اداروں کے بارے میں بے یقینی پھیلانے کا عمل، جو رپورٹنگ، کالموں اور ٹاک شوز وغیرہ کے ذریعے عام ہو رہا ہے۔
- تخریبی نیٹ ورکس کی قوت کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا۔
- پاکستان کے مستقبل کے بارے میں بے یقینی کی فضا بنانے میں انتہا پسندوں، تخریب کاروں اور ان کے پشت پناہوں سے غیر اعلانیہ تعاون۔
- سیاسی قوتوں، سول سوسائٹی اور رفاحی کاموں میں سرگرم قوتوں کے بارے میں مسلسل منفی پراپیگنڈہ۔
اور لاقانونیت کا کھلا مظاہرہ کرنے کیلئے استعمال کرنا۔

- ملک میں بے چینی بڑھا کر انتہا پسندوں اور تخریب کاروں کے مقاصد کی معاونت کرنا، اور یہ کام تخریبی سرگرمیوں کو روکنے میں ریاست کی ناکامی کو بڑھا چڑھا کر پیش کر کے جاری رکھنا۔
- صحافیانہ سرگرمیوں اور ٹاک شوز کو میڈیا اداروں کی دھونس بڑھانے اور لاقانونیت کا کھلا مظاہرہ کرنے کیلئے استعمال کرنا۔

کیا پاکستانی اخبارات اور ٹیلی ویژن چینلز ایسا مواد تواتر سے پیش کرتے ہیں جو انتہا پسندی اور تخریب کو تقویت دیتا ہے؟ یہ سوال کسی سروے میں سامنے نہیں آیا، لیکن علامات کچھ ایسی ہیں کہ پاکستانی میڈیا کے کچھ حلقوں کے کردار کو غیر ذمہ دارانہ، یکطرفہ پراپیگنڈہ، اور پیشہ ورانہ اخلاقیات کے منافی قرار دیا جا سکتا ہے۔ یعنی تبصروں، خبروں کے توڑ مروڑ کا سلسلہ اور ایک مخصوص مقتدر لابی کے مفاد میں ابلاغ کا استعمال روایت بن چکے ہیں۔ اب یہ روایت ایک خطرناک روش، یعنی انتہا پسندوں، تخریبی گروپوں اور ان کے پشت پناہوں کے مقاصد کی معاونت میں ڈھل چکی ہے۔ اس روش کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو یہ کہ میڈیا پیشہ ورانہ اخلاقیات اور قانون کے قابو سے باہر رہنے کا عادی بنتا دکھائی دیتا ہے۔ دوسرا یہ کہ غیر ذمہ دارانہ صحافیانہ سرگرمیاں معمول بن چکی ہیں۔

ایسی صورتحال میں اصلاح کی کوشش احتیاط اور گہرے مشاہدے کی متقاضی ہے۔ میڈیا کے ادارے اسی طرح مدر پدر آزاد ہوتے نظر آتے ہیں جیسا کہ یہاں کی فوج، پولیس، مذہبی گروہ اور دہشت گرد۔ گویا ایک لڑی بن چکی ہے بے قابو اور بے راہرو قوتوں کی، اس بڑھتے زعم کے ساتھ کہ اصلاح عوام اور ان بے راہرو قوتوں کے مخالف حلقوں کی ہونی چاہئے، نہ کہ اس لڑی میں بندھے کرداروں کی۔ اگر میں صحیح نتیجے پر پہنچا ہوں، تو یہ گزارش کرنے دیجئے کہ اب اصلاح کی گنجائش بہت کم رہ گئی ہے۔ لیکن ہمت ہار دینے سے حالات میں بہتری کی امید عبث ہے۔

کسی بھی اصلاحی عمل میں سب سے زیادہ اہمیت سوالات کی ہوتی ہے۔ میڈیا اور انتہا پسندی کے تعلق کے ضمن میں پہلا سوال یہ ہے کہ کیا مجرمانہ ذہنیت اب پاکستان میں دھونس، دھاندلی، بھتہ خوری اور تخریب کی صورت میں زیادہ عام نہیں ہوگئی؟ اگر ہے، تو کیا یہ ذہنیت اب صحافیوں، اینکر پرسنز، اور میڈیا مالکان میں پنپتی نظر نہیں آتی؟ کیا اس طبقے اور معاش کے افراد نے اب پولیس سے زیادہ دھونس نہیں بنالی؟ کیا خطرناک افراتفری کی صورتحال میں سیاسی اور عسکری حلقوں کو بھی میڈیا اس ملک میں سب سے زیادہ دھونس سے دباتا محسوس نہیں ہوتا؟ کیا میڈیا اب ایک خطرناک کاروبار بنتا نظر نہیں آرہا؟ اور۔۔۔۔۔ کیا میڈیا اب تخریبی گروہوں کی طرح دہشت بڑھانے اور اسے قائم رکھنے کے فارمولے پر عمل پیرا ہوتا نظر نہیں آتا؟

مخصوص پاکستانی قومیت اور قومی سلامتی کے نام پر ۱۹۷۸ تا ۲۰۰۸ پاکستان میں انتہا پسندی کو جو فروغ دیا گیا، اس کا نتیجہ ریاست مخالف قوتوں کی تقویت کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ اب ایک مزید خطرناک صورتحال تخریب کے پشت پناہوں، تخریبی نیٹ ورکس اور میڈیا کی دھونس اور دہشت بڑھانے والوں کے ساتھ ایک سنگم کی صورت میں سامنے آرہی ہے۔ اپنے اپنے میدان ہائے عمل اور دائرہ اثر میں ان تینوں قوتوں کو مسلسل تقویت بھی ملتی جارہی ہے اور یہ باہم ایک دوسرے کو بھی تقویت پہنچاتے صاف نظر آتے ہیں۔ اور ایسی صورت میں میڈیا کے کارندوں کے سامنے ریاست کی سلامتی کوئی حساس مسئلہ ہی نہیں رہا۔ صحافت اور تخریب کے طرز عمل اور مقاصد کے درمیان فاصلے سمٹنے سے دونوں عفریت ریاست اور سماج پر حملہ آور قوتوں کی مزید اٹھان کا باعث بنتے جا رہے ہیں۔ ہر حساس نوعیت کے موضوع اور تنصیب پر ان کی دسترس کچھ یوں بڑھتی جارہی ہے کہ عوام کے درمیان اور عوام اور ریاست کے درمیان باہمی تعلق میں پہلے سے موجود خلیج وسیع تر ہوتی محسوس ہوتی ہے۔ اس خطرناک سنگم کا پردہ چاک کرنے کیلئے چند حقائق کو سامنے رکھنا ہوگا۔ یہ حقیقت ہے کہ پاکستان میں ریاست اور عوام کے درمیان معاونت اور قربت کی کوئی صحتمند روایت قائم نہیں ہوسکی۔ ایک مخصوص ملا اور مذہبی سکالر طبقے نے عوام اور ریاست کے درمیان خلیج کو اس طرح مزید وسعت دی کہ ریاست کو ''غیر اسلامی'' قرار دیا اور عوام سے پیہم یہ اپیل کی کہ جب تک ریاست اسلامی شعائر نہ اپنالے، اس پر اعتبار نہیں کرنا چاہئے۔ یہی خلیج اور بے اعتباری بالآخر ایک جانب ملٹرزم اور دوسری جانب انتہا پسندی کی تقویت کا باعث بنے۔ اور اس بیچ فوجی حکمرانوں نے جلتی پر تیل یوں ڈالا کہ بین الاقوامی طاقتوں کی ایماء پر اس خطے میں پراکسی وار کا حصہ بن گئے۔

پاکستانی میڈیا کو کبھی ادراک نہ ہوا کہ ایسی صورتحال میں اس کے پیشہ ورانہ فرائض کیا ہیں۔ تخریب، ملائیت، میڈیا اور ملٹرزم کے تانے بانے کھلے عام بنتے چلے گئے۔ ایسا ہونا فطری تھا۔ ریاست اور عوام کے درمیان دوریاں مزید بڑھنے لگیں۔ اوپر سے فوجی حکمرانوں نے عوام اور ریاست کے درمیان ربط بڑھانے والی جمہوری اور سول سوسائٹی کی قوتوں کو عوامی اختیار اور آزادیوں کے فروغ کے کام سے دور رکھنے کیلئے میڈیا کو استعمال کیا۔ اور پھر انتہا پسندی سے

بھی یہی کام لیا گیا۔ یہاں پھر میڈیا اور انتہا پسندی کا سنگم مزید گہرا ہونے لگا۔

اب ایک اور سوال ہمارے سامنے ہے، وہ یہ کہ دائرہ کار و اثر میں اس سنگم کے باعث کیا میڈیا نے ملٹرزم، انتہا پسندی، بگڑتی ریاست اور تخریب کے مقاصد کو نظریاتی اور پیشہ ورانہ میدانوں میں اپنے کردار کا مستقل حصہ بنالیا؟

عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ صحافی اور اینکر پرسن (بہت سے اینکر پرسن پیشہ ور صحافی نہیں) محض استعداد کی کمی کے باعث اس سنگم سے علیحدہ رہنے کی صلاحیت سے محروم ہیں۔ میرے خیال میں ایسا نہیں۔ عملی اور مشاہداتی صلاحیتوں کی کمی کے باعث ان میں وہ اپج نہ پنپ سکی، جو اس قسم کے خطرناک سنگم سے دامن بچانے پر اکساتی ہے۔ لہذا نظریاتی آلودگی واقع ہوجاتی ہے۔ اور یہی نظریاتی آلودگی ریاست پر قابض غلط قوتوں، ان کے کرتوت اور ان کرتوت کے خطرناک نتائج کے درمیان تعلق کو واضح طور پر دیکھنے کی صلاحیت کو کند کرتی ہے۔ چونکہ ریاست کی اہمیت کا اندازہ بھی نہیں ہوتا، اس لئے یہ تحریک بھی نہیں پیدا ہوتی کہ اس سنگم کے تانے بانے کو عوام اور ملک کے لئے خطرہ سمجھ کر ملٹرزم، انتہا پسندی، میڈیا کے ناجائز استعمال، اور تخریب کے ساتھ قائم تعلق کو تنقیدی نظر سے دیکھا جائے۔ اس صلاحیت کے فقدان کے باعث ریاست کو لاحق خطرات میڈیا کے کارندوں کو کبھی سمجھ میں نہیں آئیں گے۔

اس ادراک، تحریک اور سمجھ بوجھ سے عاری میڈیا کارندے اور مالکان، جب ریاست کو عملداری سے محروم ہوتا پاتے ہیں، تو انہیں ایسی صورتحال میں خبر اور بزنس سے آگے بڑھ کر کوئی مقصد نہیں سوجھتا۔ دشتِ صحافت میں تین دہائیوں سے زیادہ وقت گزار کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں، کہ میڈیا ہاؤسز اب بے راہ روی کے ایسے ٹھکانے بن چکے ہیں جیسے کہ پولیس کے لئے تھانے جرائم کے اڈے، تخریب کاروں کے لئے پاکستانی آبادی میں نوجوان طبقے کا ایک انتہا پسند قبیلہ اور اقتدار خواہ جنرلز کے لئے فوج۔ یہی وجہ ہے کہ بڑھتی ہوئی طوائف الملوکی، ناکارہ پن اور بے حسی میں سول سوسائٹی کو تو خطرات صاف نظر آرہے ہیں، میڈیا کو نہیں، کیوں کہ خطرے سے نمٹنے میں کردار ادا کرنے سے زیادہ دھونس بنانے، مالکان کے بزنس کو فروغ دینے اور ان مقاصد کیلئے ہر خطرناک قوت جیسا بن جانے کے مرض نے اسے آدبوچا ہے۔ اسی باعث سینئر صحافیوں کو میڈیا ہاؤسز میں ادارتی فرائض کی ادائیگی سے روکا جانا اب معمول ہے جبکہ جونیئر صحافی پیشہ ورانہ اٹھان سے زیادہ دھونس سمیٹ کر دکھانے کو پیشہ بناتے نظر آتے ہیں۔ ان کے آئیڈیل وہی سینئر صحافی ہیں جن کی دھونس چلتی ہے۔ ان پر اخلاقیات کی یاددہانی کم ہی اثر کرتی ہے اور قانون کو ان کی نظر میں وہی حیثیت حاصل ہے جو کرپٹ افسروں، انتہا پسندوں اور تخریب کاروں کی نظر میں ہے۔

پاکستان میں ملٹرزم پر مبنی پالیسی انوائرنمنٹ، تخریب، ناجائز قابضین، انارکی اور ایک ابھرتے نوجوان انتہا پسند قبیلے کے درمیان تانے بانے کو سمجھنے میں ایسے صحافیوں کو دشواری ہوتی ہے جو ان عناصر کی مشترکہ فسادی سرگرمیوں اور تخریب کے پشت پناہوں کے درمیان تعلق کو اپنی رپورٹنگ، کالموں اور ٹاک شوز کا حصہ بنانے سے کتراتے ہیں۔ ظاہر ہے خوف کا عذران کی استعدادی کمی کو مسلسل تقویت دینے کا باعث ہے۔ میڈیا اور تخریبی قوتوں کے مقاصد کا سنگم اور میڈیا مالکان کی اس روش پر غور کرنا ہوگا جس کا اظہار تجربہ کار صحافی ضیاء الدین نے اگلے روز مجھ سے ایک گفتگو میں کیا۔ انہوں نے فرمایا ''مالکان اپنے ادارے کے عملے کو سینئر صحافیوں کے اثر و نفوذ سے بچا کر رکھنے میں عافیت سمجھتے ہیں۔ انہیں خوف رہتا ہے کہ اگر عملہ ایڈیٹر کے اثر میں رہا تو ہڑتال اور اجتماعی استعفوں کی صورتحال کا سامنا کرنا ہوگا۔ اسی باعث مالکان سینئر صحافیوں کو ادارتی اختیارات نہیں دینا چاہتے۔'' گویا آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ میڈیا ہاؤسز میں پیشہ ورانہ اٹھان اور اخلاقیات کے مواقع خود مالکان صحافیوں سے چھینتے ہیں۔ ظاہر ہے معیاری صحافت اب میڈیا ہاؤسز کا مقصد نہیں رہا۔ لہذا یہ اچنبھے کی بات نہیں کہ میڈیا اور تخریب کے درمیان قائم ہونے والے تعلق کے باعث اب صحافی اور اینکر پرسن نہ تو تخریب کاروں کے پشت پناہوں کے بارے میں حقائق بتا پائیں گے اور نہ ہی وہ یہ بتا سکیں گے کہ انہیں کون دھمکا رہا ہے، اور کس کے ذریعے دھمکا رہا ہے۔ اگر طالبان کل حملوں میں سے دس یا بیس فیصد حملوں کی ذمہ داری قبول نہیں کرتے، تو یہ حملے کون کرواتا ہے، یہ بتانا میڈیا اب اپنی ذمہ داری نہیں گردانتا۔ میرا خیال ہے یہ صرف پیشہ ورانہ نالائقی نہیں بلکہ فرض سے ایسی لاتعلقی ہے جو عوام دشمنی اور انتہا پسندی کی

روش کے بغیر نہیں ہوسکتی۔

میڈیا مالکان کو اس سے غرض ہے نہ ہی اس کا شعور، کہ تخریبی قوتوں اور میڈیا کارندوں کے درمیان ایک نیا غیر اعلانیہ مشترکہ پلیٹ فارم بن چکا ہے جو ملائیت اور ملٹرزم کے روایتی سنگم سے زیادہ خطرناک ہے۔ یہ پلیٹ فارم عوام اور ریاست کے درمیان کسی بھی تخریب مخالف اتحاد کی راہ میں رکاوٹ بن کر عوام اور ریاست دونوں کو بے بس کر چکا ہے۔ اس بے بسی سے تخریب کاروں کے ساتھ ساتھ میڈیا کے کارندے بھی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ یہ واویلا بھی کرتے ہیں کہ انہیں دہشت گردوں سے خطرہ ہے۔

اس صورتحال کا غور سے جائزہ لینے سے معلوم پڑتا ہے کہ اب دہشت گردانہ دھونس میں میڈیا کے کارندوں نے اپنا اسٹیک تلاش کرلیا ہے۔ ایسے ماحول میں پروفیشنل صحافت کی گنجائش کم ہی رہ جاتی ہے۔ یہ طے ہے کہ تخریب سے بڑی دھونس ہو نہیں سکتی۔ میڈیا مالکان کا بھی دھونس کے ماحول میں تخریب ہی کے ساتھ ایکا بنتا ہے۔ یہی سب سے زیادہ خطرے والی بات ہے۔ دھونس ریاست کیلئے، جو کہ قانون کی عملداری اور امن وامان کے قیام میں کامیابی کے بغیر محفوظ نہیں رہ سکتی، زہر قاتل ہے۔ ریاست کی کمزوری اور دھونس کے فروغ سے پاکستانی میں جو صورتحال بنتی ہے اس میں عوام اور ریاست کی مشترکہ بے بسی کا عالم بے مثال ہے۔

سوال یہ ہے کہ میڈیا اس خطرے کو محسوس کرتا کیوں نہیں دکھائی دیتا؟ پچاس ہزار سے زیادہ لوگ دہشت گردی کی بھینٹ چڑھ گئے۔ ایک لاکھ کے لگ بھگ لوگ زخمی ہو چکے ہیں۔ ان میں سے کتنوں کو شدید زخم آئے اور وہ باقی کی زندگی کام کاج سے قاصر ہو گئے؟ اور ان کی حالت زار کیا ہے؟ اس موضوع پر اخبارات اور ٹیلی ویژن چینل بے حس دکھائی دیتے ہیں، لیکن عدالتوں میں، جہاں ہائی پروفائل مقدمات لگتے ہیں، یہ کارندے دھڑا دھڑ پہنچتے ہیں، کیوں کہ یہاں کاروبار کے فروغ اور دھونس بڑھانے میں کام آنے والی بریکنگ نیوز دھڑا دھڑ ملتی ہیں۔

اس بے حسی پر نظر ڈالتے ہوئے اس ساری صورتحال کا ایک اور پہلو بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ اور وہ یہ کہ جس طرح میڈیا اقتدار پر فوجی قبضے کی زیادہ ملامت اور کھوج سے کتراتا ہے اسی طرح دہشت گردوں کے نیٹ ورکس اور ان کی جانب سے ڈھائے جانے والے مظالم سے بھی علاقہ رکھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اس رویئے کی توجیح تو یہی ہوسکتی ہے کہ خوف اور لالچ کی بنیاد پر ستر پوشی کی کوئی پالیسی ہے، یا پھر غیر پیشہ ورانہ روش۔ لیکن میڈیا نے اس مجرمانہ غفلت کے باوجود ایک غیر اعلانیہ مصلح کا کردار بھی ادا کرنا شروع کر دیا ہے۔ وہ ادارے جو اپنے فرائض سے مجرمانہ پہلوتہی کریں، اور پھر بھی مصلحین بن کر دکھانے کی کوشش کریں، ان کی دھونس تخریبی ہی ہوسکتی ہے۔ اور اس کی تہہ میں اس قربت کے بغیر کچھ نہیں ملتا جو انہیں تخریبی نیٹ ورکس سے ہے۔ بھلے یہ قربت نظریاتی یا ریاستی قوت کی جانب سے مینڈیٹڈ نہ ہو، لیکن یہ ان اداروں کی دھونس کو مقوی ضرور کرتی ہے۔ اور یہی دھونس پاکستان میں لاقانونیت، انتہا پسندی اور تخریب کو بے مہار ہونے کی شہ دیتی ہے۔

سول سوسائٹی اور جمہوری سیاسی قوتیں دھونس کے اس حصار اور سنگم کو توڑنے کی سکت نہیں رکھتیں۔ ان میں میڈیا کے بہیمانہ کردار کے خلاف آواز بلند کرنے کا حوصلہ بھی کم ہی نظر آتا ہے۔ شاید انہیں احساس ہے کہ میڈیا کو تخریب کے خلاف پیشہ ورانہ کردار ادا کرنے کی ترغیب دلانے میں خطرہ ہے۔ دوسری جانب بعض میڈیا کارندوں کی باتوں سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ فوج اور پولیس کے دہشت گردوں کے دباؤ میں آنے سے خط اٹھاتے ہیں۔ یہ ایک ناقابل قبول رویہ ہے۔ بعض ٹیلی ویژن چینلز پر ایسے تبصرے سننے میں آئے کہ پاکستانی فوج اور پولیس میں وہ سکت نہیں کہ تخریب کاروں کو اپنی مرضی سے اہداف کو نشانہ بنانے اور تابڑ توڑ حملے کرنے سے روک سکیں۔ گویا پولیس اور فوج بیچارگی میں نشانہ بن رہی ہیں، جسے انگریزی میں "dying wondering" کہتے ہیں۔ آئی ایس آئی کے ایک سابق سربراہ کا یہ بیان نشر کرنے میں کوئی اخلاقیات ٹی وی چینلز کے آڑے نہیں آئیں کہ ''اپنے ہاتھ کا بنایا ہوا خطرناک جن جب بے قابو ہو جائے تو اسے سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے''۔ یہ کارکردگی تخریبی ذہنیت اور حملوں کی حوصلہ شکنی کی بجائے شہ دینے والی ہے۔

تخریبی قوتوں کیخلاف عوام کا حوصلہ بڑھانے کے لئے میڈیا کے کارندے یہ اعداد و شمار دے سکتے تھے، کہ تخریب کاروں کے پاس دہشت کے ذریعے پاکستان اوراس کی ریاست کومغلوب کرنے کیلئے جو ذرائع دستیاب ہیں وہ فوج اور پولیس کے دستیاب ذرائع کے مقابلے میں ایک فیصد بھی نہیں۔ یہ تجزیہ کبھی اخبارات اور ٹیلی ویژن پر پیش نہیں کیا گیا۔ آیئے دیکھتے ہیں میرے اس تجزیئے میں کتنی حقیقت ہے اور اسے عوام، پولیس اور فوج کے حوصلے بڑھانے کیلئے میڈیا کو کیسے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

اس بات سے قطع نظر کہ تخریبی سنڈیکیٹس کے پاس کتنے تخریب کار ہیں اور وہ کتنوں کو کتنے عرصہ میں استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، یہ طے ہے کہ ان کے پاس اتنے حملہ آور کبھی نہیں تھے جتنے فوج، ملیشیا وغیرہ اور پولیس کے پاس ہیں۔ عددی اعتبار سے یہاں محتاط اندازہ ایک نسبت بارہ کا لگانا غیر حقیقی نہ ہوگا۔ بندوقوں، بموں اور دور مار اسلحہ کی فیکٹریاں فوج، ملیشیا اور پولیس کے لئے جتنا مواد فراہم کرتی ہیں، کوئی تخریبی سنڈیکیٹ اس کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس کے علاوہ ٹینک اور فضائی حملوں کی صلاحیت تخریبی تنظیموں کے پاس صفر ہے۔ انٹیلی جنس کے ضمن میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مختلف پاکستانی علاقوں میں تخریب کا آغاز کرنے اور اسے تقویت دینے والوں میں ایسے لوگ شامل تھے جو ماضی میں انٹیلی جنس کے کارندوں سے رابطے میں رہے۔ ان روابط کا انہیں کسی قدر فائدہ ضرور رہا ہوگا۔ یہاں بھی نسبت محتاط اندازے کے مطابق دس، نوے کی رہی ہوگی۔ یعنی دس حصے تخریبی تنظیموں کے پاس اور نوے حصے فوج، پولیس کے پاس۔

صلاحیت کے لحاظ سے تخریبی تنظیموں کے پاس برتری کبھی نہیں رہی۔ لیکن پھر بھی یہ تجزیہ پیش نہ کیا گیا کہ فوج اور پولیس جب بھی فیصلہ کرلیں تخریبی تنظیموں کو نیست و نابود کرسکتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ میڈیا کو یہ موقع کیونکر دیا گیا کہ وہ تخریبی پراپیگنڈے کا کھل کر حصہ بن جائے۔ اس سوال کا جواب موجودہ مضمون کے احاطے سے باہر ہے۔ اس پر پھر کبھی بات ہوگی۔

فی الحال میں صحافیوں اور اینکر پرسنز کے اس رویے کی جانب توجہ دلاؤں گا کہ وہ سیاستدانوں، بیوروکریسی اور فوج کے بارے میں جو مخالفانہ تاثر عام کررہے ہیں، اس کے موذی اثرات پہلے ہی سے ہمارے سامنے ہیں۔ سیاستدانوں، بیوروکریسی اور فوج پر توجہ مرکوز کرکے دیگر اہم معاملات سے عمومی انماز برتنے کا یہ وطیرہ عوام اور خصوصاً نوجوانوں کو جاہل بنانے کا عمل ثابت ہوا۔ اسی پراپیگنڈے کے زیر اثر پاکستانی نوجوان مستقبل کے بارے میں جو بھی سوچتے ہیں وہ زیادہ تر منفی ہے۔ وہ پاکستان کو دنیا سے کاٹ کر دیکھتے ہیں۔ یہی تو بنیادی مرض ہے جس سے دہشت گردی کو تقویت ملتی ہے۔ میڈیا کا یہ تاثر دینا کہ ریاست کبھی کچھ نہ کرپائے گی، اور پاکستان میں سارے مسائل کی جڑ سیاستدان، فوج اور بیوروکریسی ہیں، درحقیقت دہشت گردی کے فروغ میں میڈیا کو سب سے آگے لاکر کھڑا کردیتا ہے۔ ریاست اور سماج کے بارے میں مایوسی اور تنگ سی دنیا میں پھنس جانا ہی دہشت گرد بناتا ہے۔ یہ تاثر دینا کہ مایوسی نہیں چھٹ سکتی اور تنگ سی دنیا بدل نہیں سکتی، درحقیقت دہشت گردی ہے۔ جس ماحول اور جس تعلیم کے زیر اثر میڈیا کے کارندے لوگوں کو مایوسی اور ایک تنگ سی دنیا کے تصور میں پھنسانے کا وطیرہ اپناتے ہیں، اس میں احساس اور تصورات کی وسعت سے فطری طور پر مخاصمت پیدا ہوتی ہے، یعنی نئے تصورات سے بغض۔

آخر میں یہ عرض کرتا چلوں کہ اگر میڈیا کا کردار اور اثر تخریب دشمن نہ ہو تو لامحالہ تخریب دوست اور ریاست دشمن ہی ہوگا۔

مصنف نے اپنے ۳۵ سالہ صحافیانہ کیریئر کے دوران کاؤنٹر ٹیررازم ٹیکس رپورٹنگ اور دیگر اقتصادی وسیاسی موضوعات پر کام کیا۔
اس میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے:
info@individualland.com

صحافیوں کے ساتھ تربیتی نشستیں

سندس سیدہ

ہمارا ادارہ صحافیوں کے ساتھ تربیتی نشستوں کا انعقاد کرتا رہتا ہے۔اس ضمن میں ہمیں بہت سی مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑتا اور صحافیوں کی رائے کا بھی احترام کرنا پڑتا ہے۔ان کی رائے کی بدولت ہی ہم تربیتی پروگراموں کو موثر بنا پاتے ہیں۔یہی وجہ تھی کہ میں نے ان صحافیوں سے بات کی، جو ان تربیتی نشستوں کا حصہ بنتے رہتے ہیں۔اور اپنے ادارے کے ان لوگوں سے بھی رائے لی، جو ان صحافیوں سے رابطے میں رہتے ہیں۔ہمارے کوآرڈینٹر دعوت نامہ بھیجنے کے بعد، جب محترم صحافی حضرات سے ان کی حاضری یقینی بنانے کے لیے کال کرتے ہیں، تو پوچھا جاتا ہے " آپ تربیت کے لیے کوئی الاؤنس دے رہے ہیں؟" ہم بس وہی رونا رو دیتے ہیں، کہ جناب "وسائل محدود ہیں، مالی حالات ایسے نہیں کہ ہم الاؤنس دیں"۔ پھر ہمارے کوآرڈینٹر کی جانب سے سوال کیا جاتا ہے، "جناب آپ آ رہے ہیں"؟ "جی جناب! ضرور آؤں گا" یہ وہ جواب ہے جس کا ہمیں انتظار رہتا ہے۔بسا اوقات مصروفیات کے بہانے، اور نہ آنے کی وجوہات، تو ہمیں سننی ہی پڑتی ہیں تاہم آنے کی یقین دہانی پر رسمی گفتگو اور شکریہ کے بعد فون بند کر دیا جاتا ہے۔بس پھر ہماری تربیتی نشستوں پر وہی چہرے نظر آتے ہیں، جو کچھ سیکھنا چاہتے ہیں۔ہمیں خوشی اس بات کی ہے کہ ہمارے ملک میں ان لوگوں کی کمی نہیں جو اپنے کام کو بہتر بنانے کے لیے کہیں سے بھی کچھ سیکھنے پہنچ جاتے ہیں۔

میں نے ایک صحافی سے پوچھا کہ " آپ کو جب تربیت کے لیے بلایا جاتا ہے، تو آپ کیا سوچتے ہیں؟" جواب موصول ہوا" انڈیجوئل لینڈ پاکستان کے صحافیوں کو مفت میں تربیت کے لیے بلاتا ہے، یعنی کوئی الاؤنس نہیں دیے جاتے۔اس ادارے والوں کے لیے تو بس یہی کافی ہے، کہ یہ دو روزہ تربیت ایسے ہوٹلوں میں دیتے ہیں، جہاں گرمیوں میں فرحت بخش ہوا اور سردیوں میں آرام دہ ہیٹر کی سہولیات موجود ہوتیں ہیں۔اس آرام دہ ماحول میں طرح طرح کی سرد و گرم باتیں ہوتیں ہیں، اور مختلف لوگوں سے مختلف چیزیں سیکھنے کو ملتی ہیں۔ہم بھی بس یہی سوچ کر آ جاتے ہیں کہ کچھ سیکھنے کو مل جائے گا"۔

میں اس بات سے اتفاق کرتی ہوں، کہ یہ تربیتی نشستیں آرام دہ ہوٹلوں کے کمروں میں ہوتیں ہیں۔لیکن معذرت کے ساتھ، اس حقیقت کو بھی مانیں کہ اگر ایسا نہ ہو، تو وہ صحافی جو ان تربیتی نشستوں پر بار بار نظر آتے ہیں، وہ بھی نہ آئیں۔

میرے اس سوال پر کہ " الاؤنس کو آپ لوگ اتنی اہمیت کیوں دیتے ہیں؟" صحافی نے کہا" روزی روٹی ہی کے لیے تو دھکے کھا رہے ہیں۔جو اپنا کام چھوڑ کر تربیت حاصل کرنے آ جاتے ہیں، ان کو الاؤنس بھی تو ملنا چاہیئے"۔ان صحافی کا مزید کہنا تھا" کیا یہ ممکن ہے کہ انڈیجوئل لینڈ کوئی پروجیکٹ بغیر معاوضے کے کرے؟"۔اس کے جواب میں میں نے کہا" جناب جب آپ اسکول جاتے ہیں، آپ فیس ادا کرتے ہیں۔ایسا قطعاً نہیں ہوتا کہ اسکول والے آپ کو فیس دے کر پڑھنے کے لیے بلائیں۔انہوں نے ہنستے ہوئے کہا" یہ بات تو آپ ٹھیک کر رہی ہیں۔ہم بھی آپ لوگوں سے بہت کچھ سیکھتے ہیں۔صرف معاوضہ کی بات ہوتی تو ہم لوگ آپ کی تربیت میں بار بار نظر نہ آتے"۔میں نے بھی موقع غنیمت جانا اور کہہ دیا" جناب ہم بھی چاہتے ہیں کہ مختلف لوگ آئیں۔لیکن زیادہ تر صحافی تربیت حاصل کرنا ضروری نہیں سمجھتے"۔صحافی نے کہا" ہم تربیت ضروری سمجھتے ہیں اور آ بھی جاتے ہیں۔بے شک ہم نے تربیتی نشستوں سے بہت کچھ سیکھا ہے"۔

ایک صحافی سے جب میں نے سوال کیا کہ " ہمیں تربیت کو بہتر بنانے کے لیے کیا کرنا چاہیئے؟" تو ان کی رائے تھی کہ " اصولی طور پر تو یہ ہونا چاہیے کہ تمام نوٹس سی ڈیز، یو ایس بی وغیرہ میں محفوظ کر کے، تمام مواد صحافیوں میں تقسیم کیا جائے۔لیکن اس کا کوئی خاص فائدہ نظر نہیں آتا۔نصف سے زیادہ صحافی تو اس

سے مستفید ہو ہی نہیں سکیں گے۔ آخر وہ مواد بھی تو میڈیا کی باقی کتابوں کی طرح انگریزی میں ہی ہوگا۔ تو کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ ادارہ جس زبان، یعنی اردو میں تربیت دیتا ہے، اسی زبان میں اپنا کام بھی شائع کرے، اور تقسیم کیا جانے والا مواد بھی اسی زبان میں ہو؟" میں نے کہا بے شک آپ کی رائے ہمارے لیے قابلِ احترام ہے۔ لیکن کیا صحافی اتنے پڑھے لکھے بھی نہیں، کہ سادہ سی انگریزی تحریروں سے مستفید ہو سکیں؟ ہماری چند کتابیں تو ہیں ہی اردو میں۔ اور اب زیادہ تر کتابیں اردو ہی میں چھاپی جا رہی ہیں، تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان سے مستفید ہو سکیں۔

ایک رائے جو ہمیں ہمیشہ سے قابلِ غور لگی، اور جس پر ہم نے عمل بھی کیا، وہ یہ تھی کہ اکثر صحافی کہتے تھے "جیسے باقی ادارے پریکٹیکل تربیت دیتے ہیں، ویسے ہی انڈیویجوئل لینڈ کو بھی چاہیئے کہ بجائے اختلاف/تضاد جیسے موضوعات پر ایک کمرے میں بیٹھا کر تربیت، اور صرف باتیں کرنے کی بجائے پریکٹیکل تربیت

دینے کا انعقاد کرے۔ جیسے کہ اگر کوئی زخمی ہو جائے، تو فرسٹ ایڈ کی تربیت اس کے کام کیسے آئے گی اور اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کا طریقہ کار" وغیرہ۔ ہم نے اس رائے کا احترام کرتے ہوئے اس سال سے، پریکٹیکل کروانے پر زور دیا ہے۔ جیسے کہ اگر یہ سیکھانا ہو، کہ انٹرویو کیسے کرنا ہے، تو گروپ بنا کر اس کو پریکٹیکل کی صورت میں پیش کیا جائے۔ اور پھر اس پر فیڈ بیک لیا جائے۔ کیمرے کے سامنے انٹرویو دینے کا طریقہ کار اختیار کیا جائے۔ تاکہ ہمارے صحافی حضرات، جن کو کبھی کبھار ٹیلی ویژن کے سامنے آنے کا موقع ملتا ہے، ان کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ بات کیسے کرنی ہے اور کن پہلوؤں کو ملحوظ خاطر رکھنا ہے۔

ایک صحافی نے کہا" تربیت تو اچھی دی جاتی ہے، لیکن اس کو آگے بڑھانے اور دیرپا بنانے کے لیے کچھ اور لوازمات بھی ضروری ہیں۔ جیسے کہ کچھ عرصے کے بعد، اس بات کی جانچ پرکھ کی جائے کہ آخر تربیت سے صحافیوں کو حاصل کیا ہوا

اوران کی رپورٹنگ میں کتنی بہتری آئی۔اس کے لیے صرف زبانی رائے لینا کافی نہیں، بلکہ چند رپورٹوں کا موازنہ کیا جانا چاہیے، کہ تربیت حاصل کرنے سے پہلے کی رپورٹوں اور بعد کی کارکردگی میں کتنا فرق ہے"۔

ایک اور صحافی نے بھی کچھ ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا۔"۲ دن کی تربیت کے اثرات آخر کتنے دیرپا ہو سکتے ہیں، جب تک کہ ان کو دوہرایا نہ جائے؟ میرے خیال میں اپنے کام کے اثرات جانچنے کے لیے، ان لکھاریوں اور قارئین کے کام کے کچھ نمونوں کو جانچنے کی ضرورت ہے، کہ تربیت لینے سے پہلے ان کے کام میں کیا کمی تھی، جو تربیت کے بعد پوری کرنے میں کامیابی ہوئی۔اس جانچ پرکھ کے بعد ان لوگوں کو انعامات سے نوازا جانا چاہیئے، جو تربیت کے ذریعے سیکھے گئے طریقہ کار کے مطابق فرائض سرانجام دے رہے ہیں"۔ بلا شعبہ رپورٹوں کا موازنہ کرنا آسان نہیں۔اس کے لیے وقت درکار ہے۔لیکن اچھی رپورٹ لکھنے کی مشق کو مدِ نظر رکھنا چاہیئے۔

ایک صحافی کی رائے موصول ہوئی، کہ "صحافیوں کے درمیان مختلف مقابلے کروائے جائیں، جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ ان کی رپورٹنگ میں تربیت کی وجہ سے کتنی بہتری آئی ہے۔ جو صحافی معیار پر پورا اتریں انہیں انعامات سے نوازا جائے"۔ ہمارے لیے ان کی رائے قابلِ احترام ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہم اس سلسلے کا آغاز اپریل ۲۰۱۴ء کے مہینے سے کچھ اس انداز سے کریں گے، کہ خیبر پختونخواہ اور بلوچستان کے صوبوں میں جو صحافی اختلاف/تضاد کے موضوع پر بہترین رپورٹ (تمام اصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے) لکھیں گے، ان میں پہلے نمبر پر آنے والے کو ۲ لاکھ روپے انعام، ایک بلٹ پروف جیکٹ، ہیلمٹ اور فسٹ ایڈ پروفیشنل کٹ انعام میں دی جائے گی۔ جبکہ دوسری اور تیسری پوزیشن حاصل کرنے والوں کو ایک بلٹ پروف جیکٹ، ہیلمٹ اور فسٹ ایڈ پروفیشنل کٹ انعام میں دی جائے گی۔

آپ سوچیں گے کہ میں نے اپنے ادارے کی تعریفوں کے پل باندھ دیے۔لیکن میرے خیال میں اپنے صحافی بھائیوں کو یہ بتانا ضروری ہے، کہ ان کی رائے ہماری نظر میں بہت محترم ہے۔اس کام میں یہ خدشہ ضرور ہے، کہ باقی علاقوں کے صحافی ہم سے شکوہ کریں گے، کہ ان کے علاقوں کے لیے یہ اقدامات کیوں نہ اٹھائے گئے۔ تضاد کی صورتحال ان علاقوں میں زیادہ ہے، اس لیے ہم نے ان دو صوبوں سے آغاز کیا۔

اس سال تربیتی نشستوں میں صحافت کے طالب علموں کو بھی مدعو کیا گیا۔ان سے پوچھا گیا کہ ان کی رائے تربیت کے بارے میں کیا ہے؟ تو انہوں نے کہا" تربیت تو اچھی تھی، لیکن ان کی امیدوں پر یہ ادارہ پورا نہیں اترا، کیونکہ صحافت کی دنیا کے کسی بڑے نام سے ملاقات نہیں ہوئی۔ نہ ہی کسی بڑے صحافی کی جانب سے اس تربیتی پروگرام میں لیکچر دیا گیا"۔ ایک صحافی نے یہ بھی کہا کہ " آپ لوگ صحافی تھوڑی ہیں، جو تربیت دینے پہنچ جاتے ہیں۔اس کام کے لیے آپ کو کسی صحافی کو ہی بلانا چاہیئے۔ یہ ٹرینرز اور صحافیوں کی ملی جلی کاوش ہی ہے، جو اس کام کو آگے بڑھاتی چلی جا رہی ہے۔اس کے علاوہ ہم میڈیا کے صارف بھی تو ہیں۔ اور صارف جو کچھ دیکھنا چاہتا ہے، اسی حساب سے تربیت کا انعقاد کرتے ہیں۔اگر بڑے صحافی تربیت کا انعقاد کریں، اور صحافیوں کو تربیت دیں، تو ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ہم بار بار تربیتی نشستیں ترتیب دیں۔ یوں تو ہمارا کام آسان ہو جائے گا۔ میری تربیت یافتہ صحافی حضرات سے گزارش ہے، کہ ان کو بھی اپنے سے کم تربیت یافتہ صحافیوں اور نئے صحافیوں کو تربیت دینی چاہیے۔
رہی بات بڑے صحافیوں سے ملاقات کی، تو نیشنل میڈیا کانفرنس پر بڑے بڑے صحافیوں سے ملاقات کا شرف تو آپ لوگ حاصل کرتے ہی رہتے ہیں۔ وہ ان کانفرنسوں میں اپنی رائے کا بھی اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ میرے اس سوال پر کہ "صحافت کے طالب علموں کو تربیتی نشستوں سے کوئی فائدہ حاصل ہوگا"؟ صحافیوں اور طالب علموں کا کہنا تھا کہ " بالکل ہوگا۔ طالب علموں کو تربیت یافتہ لوگوں کے ساتھ بیٹھنے سے فائدہ تو ہوگا ہی، اس کے علاوہ نئی نسل کے نوجوانوں کے ساتھ بیٹھنے سے، تربیت یافتہ لوگوں کو بھی بہت سی نئی باتیں سیکھنے کو ملیں گی"۔

مصنفہ انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں ایک ریسرچ آفسر کی حیثیت سے کام کر رہی ہیں اور فردر سالے کی ایڈیٹر بھی ہیں۔
میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے
info@individualland.com

سبز ہلالی پرچم

ذوالفقار حیدر

پاکستان کو وجود میں آئے ۶۶ برس کا عرصہ بیت چکا۔ اِن ۶۶ سالوں میں پاکستان نے کیا کھویا، کیا پایا؟ اِس کا کچھ اندازہ ہم سب کو ہے۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا، کہ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد جو فیصلے ہوئے، اُن کے اثرات ہمیں چند دہائیوں بعد محسوس ہونا شروع ہوئے۔ پاکستان کے موجودہ حالات بھی انہی فیصلوں کا نتیجہ ہیں۔ میرا اشارہ ۱۹۴۹ء میں منظور ہونے والی قراردادِ مقاصد کی جانب ہے، جس میں اُس وقت کے سیاستدانوں نے قائدِ اعظم کے پاکستان کو ہمیشہ کیلئے بدل کر رکھ دیا۔ بے شک، اکثریت نے اِس قرارداد کے حق میں ووٹ دیا۔ مگر پاکستان کی اقلیتوں کے نمائندوں نے کھُل کر اِس قرارداد کی مخالفت کی۔ انہی مخالفین میں ہندو اقلیت کے رہنما جناب برات چندر منڈل بھی شامل تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ 'قائداعظم نے واضح طور پر کہا تھا، کہ پاکستان ایک سیکولر ریاست ہوگی۔'

اس کے علاوہ شری چندرا چٹوپڈھے، جو مشرقی پاکستان کے ۲۵ فیصد ہندوؤں کے نمائندہ تھے، نے ایک جذباتی تقریر کے ذریعے اسمبلی کو یہ یاد دہانی کروائی کہ ''قائداعظم کے مطابق ریاستی امور میں ایک ہندو، ہندو نہیں رہے گا اور ایک مسلمان، مسلمان نہیں رہے گا۔ مگر افسوس کہ اُن کی وفات کے اتنے تھوڑے عرصے میں ہی آپ نے عملی طور پر ریاست کے مذہب کا اعلان کر دیا۔'' انہوں نے مزید کہا کہ ''اِس قرارداد میں مجھے قائداعظم کی آواز نہیں آرہی۔ اور نہ ہی وزیراعظم جناب لیاقت علی خان کی۔ بلکہ یہ پاکستان کے علماء کی آواز ہے۔'' یقیناً علماء کی آواز ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہاں پر بنیادی اختلاف قائداعظم کے نظریات کی تبدیلی ہے اور جو قوم اپنے قائد کے نظریات کی مخالفت شروع کر دے، وہ ہمیشہ زوال کا شکار رہتی ہے۔ ریاستی امور میں مذہب کے عمل دخل سے اکثریت کو شاید کوئی خاص فرق نہیں پڑتا، البتہ اقلیتوں میں عدم تحفظ کا خدشہ ضرور پیدا ہوتا ہے۔ اور یہی خدشہ برات چندر اور شری چندرا کو تھا۔ شاید اُن کا یہ خدشہ درست بھی ثابت ہوگیا۔

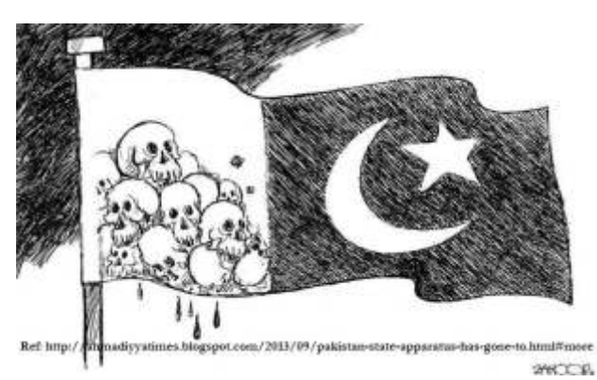

Ref: http://ahmadiyyatimes.blogspot.com/2013/09/pakistan-state-apparatus-has-gone-to.html#more

۱۹۴۹ء میں ہی مجلسِ احرار الاسلام نے تحریکِ ختمِ نبوت ﷺ کا آغاز کیا۔ جس کے تین بڑے مطالبات میں یہ شامل تھا، کہ محمد ظفر اللہ خان، جو وزیر خارجہ تھے، ان سے وزارت واپس لے لی جائے، کیونکہ وہ احمدی تھے۔ احمدیوں کو تمام بڑی سرکاری آسامیوں سے فارغ کیا جائے، اور غیر مسلم قرار دیا جائے۔ احمدیوں کو غیر مسلم قرار دینے کی کوششیں جاری رہیں۔ یہاں تک کہ ۱۹۵۳ء میں لاہور میں بسنے والے احمدیوں کو نشانہ بنانا شروع کر دیا گیا۔ جس کے نتیجے میں پاکستانی شہریوں نے پہلی بار مارشل لاء لگتے ہوئے دیکھا۔ لاہور میں فوج ۷۰ دن تک موجود رہی۔ جماعت اسلامی کے مولانا مودودی اور مولانا عبدالستار نیازی کو سزائے موت سنائی گئی، کیونکہ فوج کے مطابق، احمدیوں کے خلاف مظاہروں کی وجہ یہی لوگ تھے۔ البتہ چند دنوں میں ان کی سزاؤں کو کم کر کے عمر قید میں تبدیل کر دیا گیا۔ یہ بات یہاں ختم نہیں ہوئی، اور مذہبی جماعتوں کے دباؤ میں آکر سخت قوانین پاکستان کے آئین کا حصہ بنتے رہے۔ یہ اُس نظریے کی موت تھی جس کے تحت پاکستان وجود میں آیا تھا۔

یقیناً پاکستان مسلمانوں کے لئے بنایا گیا تھا اور وہ تعداد میں بھی سب سے زیادہ تھے۔ مگر یہاں بسنے والی اقلیتوں کو یہی کہہ کر پاکستان میں رہنے کا کہا گیا تھا، کہ انہیں یہاں پوری مذہبی آزادی حاصل ہو گی، بالکل اُسی طرح جسطرح قائداعظم نے قبائلیوں کو اُن کے طریقے سے رہنے کی اجازت دی تھی۔ مگر شاید ہم نے قائداعظم کو صرف یہ خطہ ارضی حاصل کرنے کیلئے استعمال کیا اور پھر اُن کو اور اُن کے نظریات کو خیر باد کہہ دیا۔

وقت کے ساتھ ساتھ پاکستان میں وہی ہوا، جس کی قائداعظم نے ہمیشہ مخالفت کی۔ پاکستان میں ملائیت بڑھتی گئی اور جائز ناجائز تمام معاملات پر دین کے اِن ٹھیکیداروں نے اپنی آراء سے حکومتی اور ریاستی اداروں پر کنٹرول بڑھانا شروع کر دیا۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو جیسے رہنما بھی اِن ملاؤں کی باتوں میں آ گئے۔ رہی سہی کسر ضیاء الحق نے پوری کر دی۔ ۱۹۸۶ تک پاکستان میں توہینِ رسالت کے محظ ۱۴ کیس رپورٹ کیے گئے تھے۔ جبکہ ضیاء الحق کی ترامیم کے بعد ۲۰۱۰ تک تقریباً ۱۲۷۴ کیس رپورٹ کیے جا چکے ہیں۔ اِن میں سے اکثر افراد کو عدالت پہنچنے سے پہلے ہی قتل کر دیا گیا۔ بہت سے افراد اپنی جان کی حفاظت کی خاطر چھپ کر زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔

تحریکِ طالبان، پاکستان کو ایک اسلامی ریاست مانتی ہے۔ وہ پاکستان کے قانونی اور آئینی ڈھانچے کو اپنے نظریات کے مطابق بدل دینا چاہتے ہیں۔ ان نظریات کو وہ اسلام تصور کرتے ہیں۔ کیلاش، چترال میں کیلاشیوں اور اسماعیلی مسلمانوں کو دھمکیاں ملنا اور صوبہ سندھ میں ہندو مندروں کی بے حرمتی کے واقعات سے یہ صاف ظاہر ہے کہ اکثریتی آبادی کو یہ احساس ہے کہ یہ ملک صرف اور صرف اُن کیلئے بنا ہے۔ اور انہیں اقلیتوں کو اذیت دینے کا لائسنس حاصل ہے۔ یقیناً لوگوں کو ایسے مظالم ڈھانے پر اکسانے والے شر پسند عناصر یہ سب کچھ اپنی طاقت دکھانے کیلئے کرتے ہیں۔ سابق گورنر پنجاب سلمان تاثیر کا اپنے گارڈ کے ہاتھوں قتل ہونا اور اُس قاتل کو ایک ہیرو کا درجہ دینا، ایک ایسے ملک میں ہی ممکن ہوسکتا ہے، جہاں کی اکثریتی آبادی کو یہ پوری طرح احساس ہو، کہ یہ ملک صرف انہی کے مذہب کے لوگوں کیلئے ہے۔

تو پھر ہم کیوں کر قائد کی تصویر کو اپنی دیواروں پر لگانے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ یا سر پیرزادہ کے کالم کے مطابق، ہمیں قائد کو داڑھی لگا کر اُن کا نام مولوی محمد علی جناح لکھ دینا چاہیے۔ جناب پیٹر جیکب، جو لاہور میں واقع ایک غیر سرکاری ادارے 'نیشنل کمیشن فار جسٹس اینڈ پیس' کے سربراہ ہیں، کا کہنا ہے کہ پاکستان میں رائج تعلیمی نظام اور تعلیمی پالیسی میں فرقہ وارانہ اور بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں کھُل کر سامنے آئی ہیں اور یہ کہ دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والے پاکستانیوں کو اپنی مذہبی تعلیم حاصل کرنے کی کوئی سہولت حاصل نہیں ہے۔

اسلام ایک مکمل دین ہے، جو انصاف کے تقاضے پورا کرتا ہے۔ پاکستان میں رہنے والی تمام اقلیتیں بھی پاکستانی ہیں، اور انہیں بھی وہ تمام حقوق حاصل ہیں جو یہاں کے مسلمانوں کو حاصل ہیں۔ یقیناً یہ اقلیتیں ہم مسلمانوں سے یہ اُمید کرتی ہیں، کہ ہم حقوق کے حصول میں اُن کے معاون ثابت ہوں گے۔ کیونکہ یہ ہمارا مذہبی اور قومی فریضہ ہے۔ جب پاکستان کا پرچم تخلیق کیا گیا، تو اُس میں سبز کے ساتھ ساتھ سفید رنگ بھی رکھا گیا جو کہ یہاں رہنے والی اقلیتوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ یقیناً یہ پرچم سبز ہلالی ہے مگر اس میں موجود سفید رنگ اسے اونچا رکھنے میں اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔ ہمیں ان دونوں رنگوں کو ساتھ ساتھ رکھنا ہوگا۔

مصنف انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں سینیئر پروگرام مینیجر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔

میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے
info@individualland.com

ملٹرزم اور تخریب کا بیانیہ اور نشانات

اکرام ہوتی

۲۷ مارچ ۲۰۱۴ء کی صبح عمران خان نے بنی گالا میں اپنے گھر کے احاطے میں میڈیا کو بتایا کہ مذاکرات کامیاب ہو چکے ہیں، ہمیں یہ کامیابی ہوئی ہے کہ ہم ان لوگوں کو شناخت کر چکے ہیں جو جنگ نہیں چاہتے، اور جو جنگ جاری رکھنے پر مصر ہیں۔ وہ دوسروں کے ایماء پر ایسا کر رہے ہیں۔ یہ ایک ایسا بیان ہے جو بجائے سوالات کی آگ کو ٹھنڈا کرنے اور امن کی نوید بننے کے، مزید سوالات اور خدشات کو جنم دے گیا۔

پہلا سوال: طالبان کس مقصد کے لئے "جنگ" کر رہے تھے؟ عمران خان صاحب نے فرمایا۔ "وہ شریعت کے نفاذ کے لیے نہیں بلکہ امریکہ کی جنگ سے علیحدہ ہونے کے لیے جنگ کر رہے تھے۔ اس موقف کو زیادہ پذیرائی ملتی ہے۔ لیکن یہ حقائق پر مبنی موقف ہرگز نہیں۔

دوسرا سوال: اگر طالبان امریکہ کی جنگ سے علیحدگی چاہتے تھے تو کس کے ایماء پر؟

تیسرا سوال: کیا امریکہ کی جنگ سے علیحدگی کے مطالبے کو منوانے کے لئے پاکستان کے معصوم عوام کو ہزاروں میں قتل اور لاکھوں میں زخمی، بے گھر اور دہشت زدہ کرنا ضروری تھا؟

چوتھا سوال: کیا اب پاکستان امریکہ کی جنگ سے علیحدہ ہو چکا؟

پانچواں سوال: کیا "طالبان" اس امر پر راضی ہو گئے کہ امریکہ کی جنگ سے علیحدگی پر اب وہ اپنے نیٹ ورکس ختم کر دیں گے؟

چھٹا سوال: کیا وہ ریاست کی جانب سے کوئی ایسی پیشکش حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے، جو انہیں اپنے تخریبی نیٹ ورکس ختم کرنے پر آمادہ کر گئی؟

آخری سوال: وہ پیشکش کیا ہے؟

اکر اس ترتیب سے سوالات پوچھ لئے جائیں تو عمران خان، یا وہ لوگ جنہوں نے عمران خان کو مذاکرات کامیاب ہونے کی خوشخبری سنائی، شاید کچھ کہنے پر مجبور ہوں۔ لیکن شاید ان کی جانب سے حتمی جواب پھر بھی نہ آئیں۔ ان سوالات کا حتمی جواب شاید پاکستان میں کسی کے پاس نہیں۔ کیونکہ جن حالات میں پاکستان میں تخریب کا آغاز ہوا اور اسے فروغ حاصل ہوا، وہ "پراکسی وار" کے حالات تھے۔ پراکسی وار، سیکیورٹی اسٹیٹ اور تخریبی نیٹ ورکس کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔

جو حلقے ان تین اطراف کے ساتھ ریاستی اختیارات استعمال کرتے ہوئے مسلسل رابطے میں ہیں، وہی اس ملک کے سارے حساس فیصلے بھی کرتے ہیں۔ یعنی کب پراکسی وار میں زیادہ ملوث ہونا ہے، کب سیکیورٹی ریاست کے لئے مارشل لاء کا نفاذ ضروری ہے، اور کب تخریب کو پراکسی وار کا حصہ بنانا ہے۔ چونکہ ان اختیارات اور ان فیصلوں تک رسائی صرف انہی حلقوں کو ہے جو طویل عرصہ سے ریاست پر غالب رہے، لہذا اُن کی تربیت اور اُٹھان ہی مستقبل کے بارے میں فیصلوں کو خفیہ رکھنے کی ہے۔ اور یہی خفیہ رکھنے کی پالیسی پاکستان کو ایک لمبے عرصے تک کجروی کا شکار کرتی رہی۔ اور پھر اس ملک کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا۔ اختیار اور فیصلوں پر اجارہ داری، اور وہ بھی چند سرکاری ملازمین کی، کسی بھی ملک کے ساتھ وہ کچھ کر سکتی ہے جو پاکستان کے ساتھ ہوا۔ اب بھی وقت ہے کہ پاکستان کی سلامتی کو یقینی بنانے اور عوام کو تخریب سے نجات دلانے کے لئے اُن سوالات کے جوابات دیئے جائیں جو تخریبی تنظیموں اور ان کے پُشت پناہوں کے بارے میں کئے جاتے ہیں۔ گذشتہ دس پندرہ سال محققین اور دانشوروں نے اس سوال کا جواب تلاش کرنے میں ضائع کر دیئے، کہ تخریبی کارندوں کی ذہنیت کیا ہے۔ یعنی وہ کیوں تخریبی حملے کرنے کے لیے اپنے آپ کو نقصان اور ہلاکت میں ڈالتے ہیں۔ حالانکہ سوال یہ کیا جانا چاہئے تھا، کہ ان کارندوں کو استعمال کرنے والوں کے عزائم کیا ہیں۔ اور ریاست ان عزائم کی حمایتی کیوں ہے۔ کیا محض پراکسی وار میں لی گئی رقوم کے لئے؟ اب بھی وقت ہے کہ تخریب، ریاست اور پراکسی وار کے درمیان بیہمانہ تعلق کے بارے میں عوام کو حقیقت بتا دی جائے۔ اور یہ واضح کر دیا جائے کہ تخریبی نیٹ ورکس کا وجود اور ان نیٹ ورکس کے پاکستان پر حملوں کے خلاف واضح پالیسی کیا ہے۔

یعنی اُس تکون سے ریاست کے علیحدہ ہونے کے بارے میں کیا ارادہ ہے جو تخریب اور پراکسی وار کے ساتھ اس نے گذشتہ دو دہائیوں میں بنائی۔ تخریبی نیٹ ورکس کو وجود میں لانے اور پھر ان کے خلاف واضح پالیسی نہ بنانے کی وجوہات بھی عوام کو بتا دی جائیں۔ جن قوتوں سے مذاکرات کر کے یہ خوشخبری دی جا رہی ہے، کہ وہ حملے نہ کرنے پر مان گئیں، ان قوتوں کی اصل حقیقت سامنے لانا ضروری ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ تخریب، تخریبی کارندوں اور تخریبی نیٹ ورکس کے درمیان تعلق کے بارے میں فضول مباحث بند کر دی جائیں۔ اور اس تکون کی بات کی جائے جو تخریبی نیٹ ورکس، ریاست اور پراکسی وار کے درمیان بنی۔ پاکستان کو قائم رہنا ہے۔ اور یہاں کے عوام کہیں نہیں جا رہے۔ پاکستانیوں اور ریاست کو تخریب پال پالیسیوں کے نتائج بھگتنا ہیں۔ لہٰذا یہ معلوم ہونا ضروری ہے، کہ عوام دشمن پالیسیاں بنانے والوں کا تخریبی نیٹ ورکس کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ کیا یہ اسلام کا تعلق ہے؟ یا روپے پیسے کا؟ حکمت عملی کا تعلق ہے، یا عوام دشمنی کا؟

گذشتہ تین چار دہائیوں سے ریاست سے جڑے حاضر سروس اور ریٹائرڈ حلقے عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے رہے ہیں، کہ جہادی جتھے پاکستانی ریاست کے "اضافی محافظ" ہیں۔ ساری دنیا میں ان اضافی محافظوں کو تخریب کار ہی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ ریاست کے کم خرچ بدمعاش ہوتے ہیں۔ اور اگر اس مافیا کی حرکتوں سے علاقے اور دنیا میں اس ریاست کے خلاف صف آرائی ہونے لگے، تو ان بدمعاشوں کو ریاست پھر بھی استعمال کرنا جاری رکھتی ہے۔ اور پھر اُس کی خیر نہیں ہوتی۔ ایسی ریاست سے دنیا کی کوئی قوت جائز تعلق قائم کرنے کا نہیں سوچ سکتی، جو تخریبی قوتوں کو ملیا میٹ کر دینے کی قوت رکھتے ہوئے بھی بہانے بناتی رہے، اور مذاکرات کر کے امن حاصل کرنے کا فارمولا اپنائے۔ اور اس پر طرہ یہ کہ مذاکرات کی کامیابی کی نوید بھی بڑے فخر سے سنائے۔ گویا تخریب کاروں پر قابو پا لیا گیا ہو، اور وہ بھی "مزید تخریب" سے بچ کر۔ دنیا میں شاید ہی ایسی کوئی ریاست ہوگی، جو اتنی ڈھٹائی سے عوام کو دھمکی دے، کہ جتنے لوگ مر گئے انہی پر صبر و شکر کر کے تخریبی قوتوں سے امن کی بھیک مانگنے دو۔ ورنہ مزید تباہی ہوگی۔ جس قسم کا امن تخریبی قوتوں سے درخواست کر کے پاکستانی ریاست حاصل کرنا چاہ رہی ہے، وہ امن کے نام پر ایک دائمی خطرہ ہے۔ ظاہر ہے جو لوگ طالبان کو استعمال کر رہے تھے، وہ ریاست سے کوئی سیاسی، مالی اور قانونی مراعات حاصل کر کے ہی امن کا وعدہ کر رہے ہیں۔ اور ان مراعات کے ملنے کے بعد طالبان اور ان کے پشت پناہ ریاست میں اپنے استعمال کرنے والوں سے زیادہ تگڑی پوزیشن میں ہوں گے۔ یہ لامحالہ ایک مغلوب ریاست ہوگی۔

ریاست نے اپنے لئے یہ قبر خود ہی کھودی۔ یہ کام ملٹرزم اور پراکسی وار کے راستے پر پڑ کر کیا گیا۔ ایسی کوشیشیں کی گئیں کہ ریاست اور عوام کے درمیان تعلق کو جارحیت بڑھانے کے لئے استوار کیا جائے۔ ریاست، تخریب اور تخریبی نیٹ ورکس کے درمیان جو تکون بنی، اُس کی تہہ میں بننے والی دوسری تکون کو عرصہ دراز سے پوشیدہ رکھا گیا ہے۔ یہ تکون ریاست، انتہا پسند قوتوں اور تخریبی کارندوں کے درمیان بنی۔ پہلی تکون بننے کی ایک تاریخ ہے، جو ملٹرزم، مذہبی تنظیموں اور جہادی سرگرمیوں کے درمیان ناقابل تنسیخ تعلق سے عبارت ہے۔ اس تعلق کو استوار کرنے کے لئے ایک قومی بیانیہ وجود میں لایا گیا۔ اسی مقصد کے لئے لڑاکا ریاست اور قوم کو تشبیہات، نشانات، نعروں اور ماڈلز کے ذریعے عوام کے ذہنوں میں راسخ کیا گیا۔ ان نعروں اور نشانات وغیرہ میں سب سے زیادہ نمایاں جنگی ہتھیار اور ترانے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ ایسے مذہبی اور قومی اشاریئے تھے جو عوام کو ملٹرزم، جہاد اور بالآخر تخریب کے مقاصد سے ہم آہنگ کرنے کے لئے سامنے لائے گئے۔ ان نشانات، نعروں، ترانوں، اشاریوں اور ان کے مجموعے، یعنی قومی عسکری بیانئے کے خلاف وقتاً فوقتاً دانشوروں اور سیاستدانوں کی جانب سے بیانات، تحاریر اور کتب سامنے لانے کی روایت بھی پاکستان میں موجود ہے ان میں سب سے نمایاں کتب انگریزی میں لکھی گئیں۔ انہی میں سے تواتر کے ساتھ حوالہ "مرڈر آف ہیسٹری" اور "ملٹری" کا دیا جاتا ہے۔ یہ دونوں کتب اس وقت سامنے آئیں جب ریاست کی پراکسی وار اور انتہا پسند تنظیموں کے ساتھ تکون بن چکی تھی۔ اور دوسری تکون، یعنی ریاست، تخریبی تنظیموں اور تخریبی ملٹرزم اپنے تکمیلی مراحل میں تھی۔ جب ایسی تکون بن رہی تھی اس وقت شاہراہوں پر ٹینکوں اور جہازوں کی تنصیب کا عمل جاری تھا۔ ساتھ ہی ساتھ قائداعظم کو شیروانی، قراقل کی ٹوپی میں ملبوس شخصیت کے طور پر تصاویر کے ذریعے سامنے لایا گیا۔ جن تصاویر میں جناح صاحب بلیرڈ کھیلتے، سگریٹ پیتے

اور مغربی لباس میں ملبوس نظر آتے تھے، آہستہ آہستہ انہیں عوامی نظر سے اوجھل کرنے کا رجحان ریاستی پالیسی بنتا نظر آیا۔ یہ وہی ۱۹۷۸ تا ۱۹۸۸ء کا دور تھا جب پراکسی وار کا پہلا مرحلہ آیا۔ اور مغرب سے ڈالر لے کر مشرق کو مزید مشرقی بنانے اور جہاد کو فروغ دینے کی پالیسی پاکستان کو ایٹمی تجربے کے قریب لائی۔ پھر ٹینکوں اور جہازوں کے ساتھ ساتھ میزائلوں اور ایٹمی تجربے کی سائٹس کے ماڈل بھی شاہراہوں پر نظر آنے لگے۔ یعنی جدید قائداعظم کو ڈھانپنے عسکری ریاستی قوت کے ساتھ انتہا پسندی اور پراکسی وار کی آمیزش سے ابھرتا ایک بے ڈھنگا پاکستان، جس کی تخریب کی ڈگر پر پھسلن کے سامنے کوئی رکاوٹ نہ تھی۔

"مرڈر آف ہیسٹری" اور "ملٹری" جن لوگوں کو تنبیہ کرنے کے لئے لکھی گئیں۔ وہ منہ کھولے یہ سب کچھ دیکھ کر کڑھتے رہے۔ کر کچھ نہ سکے۔ ظاہر ہے، بیانئے اور نشانات، پراکسی وار اور جہاد کے ساتھ تکون بنانے والی عسکری ریاست کے سامنے دلیل اور خدشات کی حیثیت کچھ بھی نہ تھی۔

آج کل ایک جوابی بیانئے کی بات کی جاتی ہے۔ اس کے نشانات، دلائل، الفاظ کا چناؤ، نعرے اور ترانے کیا ہو سکتے ہیں؟ کون سا لباس، ماڈل اور طرز تکلم نئے بیانئے کو تقویت دیں گے؟ یہ سوال اپنی جگہ۔ میرے خیال میں ریاست کے عسکری اور تخریبی قوتوں کے ساتھ تکون بنانے، اس کے بیانئے اور نشانات وغیرہ کا دور گزر چکا۔ کیونکہ تخریب نے ریاست کے وجود ہی کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ لہٰذا جوابی بیانئے کا دور بھی گزر چکا۔ اب نہ تو نشانات اور نعروں سے، نہ ماڈلز اور تحاریر سے بات بنی گی۔ اب ایک ایسی سیاسی تحریک کا دور ہے جو ریاست کو بچائے۔ نیا بیانیہ تحریک سے جڑا ہونا چاہئے۔ اور یہ تحریک فوج، سول ڈائیلاگ، نئے سماجی کنٹریکٹ، اور ریاست کو خطرناک تکونوں سے نکال کر اسے تخریب کے مقابل لا کھڑا کرنے کے لئے ہونی چاہئے۔ اگر یہ تحریک کھڑی ہو جائے تو خود ہی جوابی بیانیہ بھی بنتا چلا جائے گا۔

"ملٹری" کی مصنفہ، ڈاکٹر عائشہ صدیقہ سے جب اس مضمون کے سکوپ اور بیانئے اور نشانات کی اہمیت کے بارے میں تبصرہ کرنے کو کہا گیا تو انہوں نے فرمایا: ملٹرزم ایک بہت بڑا موضوع ہے۔ اس عمل میں نشانات اور بیانیہ وغیرہ عوام کی نفسیات کو عسکری بنانا ہوتا ہے۔ جب ان سے دریافت کیا گیا کہ کیا ساتھ ہی ساتھ ایک مذہبی قومیت کو بھی اس کوشش سے جوڑا جاتا ہے، تو انہوں نے کہا: عسکریت پسند ریاست کے لئے ضروری ہے، کہ اس سے مطابقت رکھتی قومیت کو استوار کیا جائے۔ یہ کام بھی نشانات اور عسکری ماڈلز وغیرہ کے ذریعے کیا جاتا ہے۔

یہاں ضروری ہے کہ جس قسم کی قومی جارحیت کو فروغ دینے کے لئے قومی نشانات، ترانے اور ماڈل وغیرہ سامنے لائے گئے ان کے بارے میں ایک کلاس روم طرز کا سوال کیا جائے۔ مثلاً کیا قائداعظم کی سگریٹ پیتے، بلیرڈ کھیلتے اور مغربی لباس میں لی گئی تصاویر کو پوشیدہ رکھنے اور ان سب کی جگہ ایسے نشانات، ترانے اور ماڈل سامنے لانے سے جو نتائج مقصود تھے۔ وہ حاصل ہو گئے؟ اس سوال کے دو جوابات ہیں۔ اگر تو ان سے مقصود یہ تھا۔ کہ پاکستان ایک جارحانہ اور خود ہلاکتی قوم کے طور پر تشکیلی عمل سے گزرے۔ تو یہ ہدف بطور احسن حاصل کر لیا گیا ہے۔ اور اگر مقصود یہ تھا کہ اس ملک کا دفاع مضبوط ہو تو نتائج ہدف کے بالکل الٹ نکلے ہیں۔ آج اگر عمران خان اور دیگر لوگ ہمیں یہ خوشخبریاں دیتے ہیں کہ ہم نے طالبان سے جو امن کی بھیک مانگی اس کا مثبت نتیجہ نکلنے والا ہے، تو پھر یہ سوال اٹھتا ہے، کہ کہاں گئے وہ بلند و بانگ اہداف کہ یہ ملک ایک منفرد قسم کا قلعہ بنے گا بلکہ جہاں جہاں اسلام کے مطابق نظام اور ثقافت نہ ہو وہاں دراندازی بھی کرے گا؟ طالبان سے امن کی بھیک مانگنے اور ان کی جانب سے چند مثبت اشارے ملنے پر خوشخبریاں سنانے والے ایسے موقع پر کیا جواب دیں گے؟ وہ قومی نشانات اور ماڈل جن سے فوج کی عظمت، ملک کی جارحانہ بقاء کی پالیسی اور دنیا میں سب سے منفرد ہونے کے ارادے ظاہر کرنا مقصود تھا، اب کس حیثیت سے برقرار رہ سکتے ہیں۔ کیا وہ قومی بیانیہ، جو ان نشانات اور ماڈلز کے زریعے استوار کیا گیا، اب زندہ رہ سکتا ہے؟ یہ امر اب واضح ہے کہ نشانات، ماڈلز اور بیانیہ پاکستانیوں سے وہ کچھ پوشیدہ رکھنے کے لئے سامنے لائے گئے۔ جو ان کے اجتماعی فائدے میں تھا اور ہے۔ اور وہ کچھ ان کی زندگی کا حصہ بنانے کے لئے جو اجتماعی خودکشی کے لئے تیار کرتا ہو، لیکن ایک مافیا کو پاکستان پر مسلط کئے رکھے۔

مصنف نے اپنے ۳۵ سالہ صحافیانہ کیریئر کے دوران کاؤنٹر ٹیررازم ٹیکس رپورٹنگ اور دیگر اقتصادی و سیاسی موضوعات پر کام کیا۔
اس میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے:
info@individualland.com

اسلامی نظریاتی کونسل

عاطف فاروق خان

اسلامی نظریاتی کونسل ایک آئینی مشاورتی ادارہ ہے، جسے آئین کی شق ۱۹۹ کے تحت یکم اگست ۱۹۶۲ کو قیام میں لایا گیا۔ آغاز میں اسے "اسلامی نظریات کے لئے مشاورتی کونسل" کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اس کونسل کی ترتیب وتعین کا اختیار صدر مملکت کے پاس تھا، اور اس کا مقصد اولین پاکستان کے مسلمانوں کی زندگی اسلام کے اصولوں اور تعلیمات کے مطابق ڈھالنے کے لئے، تجاویز پیش کرنا تھا۔

اس ادارے کی ویب سائٹ کے مطابق اس کا کام قانون ساز ادارے کو کسی مخصوص قانون کے بارے میں یہ مشورہ دیتا ہے، کہ قانون اسلام، یعنی قرآن و سنت سے متصادم ہے یا نہیں۔ مولانہ شیرانی نے ۱۰ مارچ ۲۰۱۴ کو یہ بیان دیا، کہ طویل غور وفکر کے بعد ادارے کی دوروزہ میٹنگ کے بعد، ادارے نے یہ فیصلہ کیا ہے، کہ دوسری شادی کرنے کیلئے، پہلی زوجہ سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہونی چاہئے۔ یہی نہیں، انہوں نے یہ بھی فرمایا، کہ پاکستان میں مروجہ مسلم فیملی لاء آرڈیننس کے تحت، کم عمر بچوں کی شادی کی مخالفت غیر اسلامی ہے۔ جناب چیئرمین کے مطابق، موجودہ ازدواجی قوانین غیر منصفانہ ہیں، اور "شادی کے لئے کوئی عمر متعین ہی نہیں کی جاسکتی"۔

اگر جناح کے تصورات کے مطابق جدید فلاحی جمہوری پاکستان کے تقاضوں کو سامنے رکھا جائے، تو اسلامی نظریاتی کونسل کا کردار ایک ایسی قدامت پسند قوت والا محسوس ہوگا، جس نے ملک کا ایک منفی امیج پیش کیا ہے۔ اس کا پاکستان کے لئے ایک قدامت خواہ اور ترقی مخالف نظریئے پر اصرار، نہ صرف ترقی پسندانہ سوچ کی راہ میں رخنہ ہے، بلکہ اس سے ترقی مخالف رویوں، عدم برداشت، کہن پرستی اور دانش دشمنی کو تقویت ملتی ہے۔ اس روش کے بارے میں احتیاط کے سارے تقاضوں کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے یہ کہنا ضروری ہے، کہ ملک کی موجودہ صورت حال میں ایسے بیانات خطرے کی گھنٹی کا کام دیتے ہیں۔

موجودہ قانون کے مطابق پہلی بیوی کی رضامندی کے بغیر، دوسری شادی کی سزا ایک سال قید اور پانچ ہزار روپے جرمانہ ہے۔ اگر کسی خاتون کے اس تکلیف دہ احساس کو نظر انداز کر دیا جائے، کہ اسے سوتن کو قبول کرنا ہوگا، پھر بھی اسلامی نظریاتی کونسل کی 'سفارش' نہ صرف پراسرانہ قدامت کی غمازی کرتی ہے، بلکہ عورت کو کسی 'شے' کے درجے تک گرا دیتی ہے۔ ایسی سفارش کرنے والوں کے نزدیک عورت ذات کی رائے اور رضا کی کوئی اہمیت نہیں، اور صرف مرد ذات کو ازدواجی فیصلوں کا اختیار حاصل ہے۔ گویا عورت اپنے شوہر کے لئے ایک کھلونا ہے، جو مردوں کے درمیان کئے گئے فیصلوں کو بلا چوں وچرا تسلیم کرنے کی پابند ہے۔

دوسری "سفارش" "میں" بچوں کی شادی کے امتناعی قانون "پر براہ راست سوال اُٹھایا گیا ہے۔ وہ قانون، جس کی تشکیل کو اس ملک کے خالق نے تندہی سے حمایت ومعاونت کی۔ جناح نے اس قانون کو مسلمان بچیوں پر لاگو کروانے کے لئے قانونی جنگ لڑی، حالانکہ بنیادی طور پر اس کا مسودہ، ہندو لڑکیوں کے تحفظ کے لئے ترتیب دیا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جناح نے اس رواج کو انتہائی ظالمانہ اور خوفناک "شیطانیت" بتایا تھا۔ اگر اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارش پر عملدرآمد ممکن ہو جائے، تو پانچ اور چھ سالہ بچی کا نکاح بھی جائز قرار پائے گا۔ ان کی رضامندی کے تقاضے کو تسلیم ہی نہیں کیا جائے گا، اور ان کی شادی ایسے مردوں سے بھی کروائی جاسکے گی، جو ان سے دوگنی عمر کے ہوں۔ اور یہ سب قانون کے عین مطابق ہوگا۔

بچپن کی شادیوں کی روش، جو کہ پاکستان تک محدود نہیں، جدید دور میں ایسی لعنت سمجھی جاتی ہے، جو ترقی پذیر ممالک کے لئے انتہائی مکروہ ہے۔ یہ بچوں سے ان کا بچپن چھین لینے کے مترادف ہے۔ کھیلنے اور اوائل عمری کے سپنے بننے کی عمر میں، بچوں کو شادی کے بندھن اور ذمہ داریوں میں پھنسانے کا عمل نہ صرف ظالمانہ بلکہ مکروہ ہے۔ انہیں شوہروں اور سسرالیوں کی خدمت پر لگا کر، فیصلہ کرنے اور فطری سماجی زندگی بسر کرنے کے حق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔

سماجی اور نفسیاتی نکتہ نظر سے دیکھا جائے، تو یہ روش قید وبند میں محسوس کی جانے والی اذیت سہنے پر مجبور کرتی، اور تعلیم کے حق کو غصب کرتی ہے۔ یہ اس اصول احسن کی ظالمانہ نفی ہے کہ "ایک عورت کو زیور تعلیم سے آراستہ کرو، پورا خاندان تعلیم یافتہ ہوگا۔ اور وہ بھی ایک ایسے ملک میں جہاں سکول چھوڑنے کا رجحان بحرانی صورت اختیار کر چکا ہے، اور غربت بڑھ کر اقتصادی ترقی کو ناممکن بنا رہی ہے۔

بچوں کا جنسی استحصال، کم عمری کی شادی کا ایک اور شاخسانہ ہے۔ کم تعلیم یافتہ لڑکیاں، خصوصی طور پر شوہروں کے مظالم کا شکار بنتی ہیں۔ چونکہ ایسی لڑکیاں حقوق و اختیار کے لحاظ سے فرد بننے سے قاصر ہوتی ہیں، ان کے ساتھ ایسا برتاؤ جو زیادتی پر محمول کیا جا سکتا ہو، شدید ذہنی دباؤ، اور پھر گہری نفسیاتی کشمکش میں مبتلا کرتا ہے۔ وہ دائمی مریض بن جاتی ہیں۔ کم عمری میں جسمانی کم مائیگیاں زچگی سے متعلقہ مراحل سے گزرنے میں مانع ہوتی ہیں۔ انہی مراحل سے گزرنے پر مجبور کرنے کے باعث، نوزائیدگان اور ماؤں کی اموات بھی واقع ہوسکتی ہیں۔ این ڈی ایف ڈی اے کے مطابق ۲۰ تا ۲۴ سالہ خواتین کے مقابلے میں ۱۰ تا ۱۴ سالہ لڑکیوں کی دوران زچگی یا اس سے پہلے کی اموات کا احتمال نسبتاً کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ جنسی پیچیدگیاں ایک طرف، کم عمر لڑکیوں کے عمر رسیدہ شوہروں سے بندھن سے، جو کہ جنسی ماضی رکھتے ہیں، ایچ آئی وی ایڈز میں مبتلا ہونے کا احتمال بھی زیادہ ہوتا ہے۔

ہمارے سماج میں بچوں سے زیادتی معمول ہے۔ خواتین کو ناکارہ بنا کر رکھ دیا گیا، اور ایک بھاری اکثریت کو خواتین کے حقوق کا احساس تک نہیں۔ عورتوں پر تشدد کو بیہمانہ نہیں سمجھا جاتا، اور اس رویے کا اظہار بچوں کے ساتھ جنسی زیادتی، ہراساں کرنے، خواتین پر تیزاب پھینکنے، غیرت کے نام پر ان کا قتل، گھریلو تشدد، اور خواتین کو گھر تک محدود کر دینے سے ہوتا ہے۔ صرف لاہور میں اگست ۲۰۱۳ میں، جنسی زیادتی کے ۱۱۳ مقدمات درج ہوئے۔ اس ایک ماہ میں اجتماعی زیادتی کے ۳۲ مقدمات بھی درج ہوئے۔ ہمارے ہاں خواتین پر تشدد کی قبولیت اس قدر پیوست ہے، کہ کھیلوں کے مشہور ہیروز، جن کی لاکھوں لوگ پرستش کرتے ہیں، وہ بھی کھلے عام، خواتین کو باورچی خانوں تک محدود کرنے کو جائز قرار دیتے ہیں۔ پاکستان نے کنونشن آن دی رائٹس آف چائلڈ پر ۱۲ نومبر ۱۹۹۰ کو دستخط کیے۔ یہ عالمی ادارہ بچوں کو تحفظاتی قوانین تک رسائی دیتا ہے، جو کہ زندہ رہنے، نقصان دہ اثرات سے تحفظ، استحصال سے بچاؤ، اور کامیاب زندگی گزارنے کے لئے لازمی ہیں۔ یہ ادارہ بچوں کو گھریلو، ثقافتی اور سماجی معاملات میں قانون تک رسائی فراہم کرتا ہے۔ ایسے قانون پر دستخطوں کے بعد، اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارش تسلیم کرنا کھلا اعلان ہوگا، کہ پاکستان اس کنونشن کو نہیں مانتا۔

اسلامی نظریاتی کونسل کا ایجنڈہ نہ صرف اس اعلان پر مجبور کرتا ہے، بلکہ یہ تکریمِ انسانیت کے عالمی اصول سے بھی متصادم ہے۔ جب اس کونسل کے بڑوں سے پوچھا جاتا ہے، کہ وہ ایسے سفارشات کیوں کرتے ہیں، تو اُن کا جواب یہی ہوتا ہے، کہ ایسا اسلامی قوانین اور آئین کے ذریعے اُن کے نفاذ کے لئے ضروری ہے۔ پاکستانی ریاست ان سفارشات پر عمل کر کے عالمی کنونشن کے صریح خلاف ورزی کرے گی۔ آئین میں بنیادی تبدیلیاں انسانی تقاضوں کے خلاف نہیں ہونی چاہیں۔ سندھ اسمبلی کی حالیہ قرارداد، کہ اسلامی نظریاتی کونسل کو ختم کر دیا جائے، کیونکہ یہ پاکستان کے ترقی کے خلاف ایک قدامت پرست ادارہ ہے، قابل تعریف ہے۔ لوگوں نے اس قرارداد کو درشت قرار دیا، لیکن انہیں ڈاکٹر خالد مسعود سے اس سلسلے میں ضرور مشورہ لینا چاہئے۔ یہ صحیح ہے کہ اس قسم کے حل سے پاکستانی ریاست اور مذہب کو گڈمڈ کرنے کی کوششوں کو، کوئی خاص ضعف نہیں پہنچے گا۔ جمعیت علماء اسلام کے سربراہ، مولانہ فضل الرحمٰن کا اس قرارداد کے خلاف بیان، پاکستان میں ایسے نظام کی حمایت ہے، جو لوگوں کو ثقافتی کنفیوژن میں مبتلا کرتا ہے۔ تاہم ہمارے میانہ رو لوگوں میں بھی ایک ذہنی تضاد ہے۔ وہ ایک جانب عوامی معاملات میں مذہب کی دخل اندازی کو جائز قرار دیتے ہیں۔ جبکہ وہ طالبان کی مخالفت بھی کرتے ہیں۔

مصنف انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں کمیونیکیشن آفیسر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔
میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے
info@individualland.com

سٹرجیکل سٹرائیکس، این آئی ایس پی اور پاکستان کا امیج

اکرام ہوتی

بین الاقوامی سیاسی حلقوں میں پاکستان کے امیج کے بارے میں میڈیا اور تجزیہ نگار خاصے حساس ہوتے جا رہے ہیں۔ البتہ اس احساس کے باوجود کہ تخریب پاکستان کا امیج بگاڑ رہی ہے اُسے ختم کرنے کیلئے قابل عمل اقدامات کی کھوج لگانا ان کے نزدیک کسی اور کی ذمہ داری ہے۔ انتہا پسندی خطرناک حد تک بڑھ گئی ہے لیکن اگر اس کے باعث پاکستان کے امیج کو نقصان پہنچتا ہے تو اُن کے خیال میں قصور ان کا ہے جو پاکستان کو انتہا پسندی کی آماجگاہ سمجھتے ہیں۔ امیج کے بارے میں حساس ہونے اور پھر خرابی کی اصل وجوہات کو تسلیم کرنے سے ڈھٹائی بھرا انکار۔۔ یہ رویہ نہ تو اصلاحی ہے اور نہ ہی نارمل انسانوں والا۔

عالمی سیاسی حلقوں میں پاکستان کے بارے میں دو تصورات گزشتہ چند سالوں سے پختہ ہوتے جا رہے ہیں، ایک یہ کہ:۔

> ’’ پاکستان ایک فرنٹ لائن سیکورٹی ریاست ہے، جہاں بدامنی، تخریب، انتہا پسندی، جہالت، پسماندگی اور اکھڑ پن جیسی علامات صاف ظاہر ہیں۔‘‘

دوسرا یہ کہ:۔

> ’’ پاکستان کے مخدوش حالات اور سیاسی پسماندگی، کرپشن اور بدامنی کو بہانہ بنا کر، فوج آئے دن اقتدار پر قبضہ کر لیتی ہے۔۔۔ اور پھر فوجی قبضے ہی کے تحت اس ملک میں سیاسی بے راہ روی، دہشت گردی، پسماندگی اور ریاست دشمنی مزید بڑھتی ہے۔‘‘

پاکستان کے بگڑتے حالات چونکہ ان دو تصورات کو تقویت بخشتے ہیں، لہٰذا عالمی سیاسی حلقے اس کج بحثی میں نہیں پڑتے کہ حالات کی خرابی کی وجہ پاکستان کے اندر نہیں بلکہ کہیں اور ہے۔ امریکہ اور یورپ کے اخبارات اور میگزین اس تھیوری کو زیادہ وزن نہیں دیتے کہ پاکستان نے عالمی طاقتوں کے لئے پراکسی وار میں اپنا برا حال کر لیا، یا یہ کہ سارا کیا دھرا عالمی پالیسی سازوں کا ہے۔ سیاسی اور سفارتی حلقے تو دبے لفظوں میں یہاں تک کہتے ہیں کہ ’’اگر آپ کے جرنیلوں نے فنڈز اور دیگر وصولیاں غلط طریقے سے استعمال کی ہیں، اور اس پراکسی وار میں ملوث ہو کر ریاست اور عوام کا تحفظ کرنے سے غافل رہے، تو اس میں بین الاقوامی قوتوں کا کیا قصور ہے۔‘‘

پاکستان کی سول سوسائٹی اور جمہوری قوتیں بھی ان عناصر سے نالاں ہیں جنہوں نے پراکسی وار میں ناکوں ناک ڈوب جانے کے دوران ریاست کے تحفظ اور تخریب سے بچاؤ کیلئے اقدامات نہیں کئے ۔عالمی سیاسی حلقے پاکستان کی عمومی بے راہ روی کا ذمہ دار انہی قوتوں کو قرار دیتے ہیں جنہوں نے ملک کے حساس اختیارات کا بلا روک ٹوک استعمال کرتے ہوئے کبھی اسلام کے نام پر جہادی قوتوں کو تخلیق کیا، اور کبھی تخریب کا راستہ روکنے کے نام پر انتہا پسند قوتوں کی پشت پناہی کی۔ اس با اختیار ٹولے کے کرتوتوں کی پردہ پوشی پاکستانی میڈیا تو کرتا ہوگا، عالمی میڈیا ایسا کرنے پر مجبور ہرگز نہیں۔لہٰذا عالمی سطح پر پاکستانی امیج ہولناک کجروی ہی سے متعین ہوتا ہے، نہ کہ یہاں کے ان پبلسٹی فنکاروں کی خواہش کے تحت، جو آج تک ان سوالات کا جواب نہیں دے سکے کہ اسامہ بن لادن کو ایبٹ آباد میں کیوں رکھا گیا، وہ فنڈز کہاں گئے جو پاکستان نے پراکسی وار کیلئے وصول کئے؟ پاکستان تخریبی قوتوں کے خلاف پولیس اور فوج کا صحیح استعمال کر کے سری لنکا کی طرح انہیں شکست دینے کی پالیسی اختیار کیوں نہیں کرتا؟ تخریبی دھڑوں سے پاکستان کی ریاست کے اندر کے با اختیار اور باوسیلہ حلقوں کے کیا باہمانہ تعلقات ہیں؟

پاکستان کے امیج کا ایک تو ایسے سوالات کے تشنہء جواب رہنے کے باعث نقصان ہوتا ہے۔ دوسرا وقتاً فوقتاً خوفناک قسم کے دہشت گرد حملوں کے بعد یہ بحث چھڑ جاتی ہے کہ آخر پولیس اور فوج کس کام پر لگا دی گئی ہے کہ اسے دہشت گردوں سے ریاست اور عوام کو بچانے کی نہ فکر ہے، نہ ہی اس کی تربیت اور نہ ہی فکر کرنے اور تربیت حاصل کرنے کی تحریک۔

دہشت گردوں کے مبینہ ٹھکانوں پر سرجیکل سٹرائیکس اور پھر ۲۵ فروری ۲۰۱۴ کو ایک نئی سیکورٹی پالیسی این آئی ایس پی کے سامنے آنے کے بعد بھی، پاکستان کے امیج میں فوری بہتری کے کچھ زیادہ امکانات نہیں۔ یہ افسوسناک صورتحال ہے، لیکن اس حقیقت سے نظریں چرانے سے حاصل وصول کچھ نہ ہوگا۔

پاکستان میں بیٹھے تصور کیجئے، عراق، یمن، شام، لیبیا اور مصر میں بگڑتے حالات کے باعث ان ممالک کے بارے میں کیا امیج بن رہا ہے۔اور پھر یہ بھی سوچئے کہ اگر پاکستان کے بارے میں امریکہ میں برا امیج بن بھی رہا ہے، تو آپ کیوں کڑھیں۔ اگر آپ کو خراب امیج سے کوئی پرابلم ہے تو آپ اپنے حالات بہتر کرنے کیلئے کوئی اچھا راہِ عمل کیوں نہیں سوچتے۔

ظاہر ہے مذکورہ بالا ممالک کا امیج حالیہ کچھ سالوں سے یہی ہے کہ یہاں انتہا پسند اور تخریبی قوتوں نے لمبے عرصے کیلئے ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ اور ریاست اور سماج ان کے سامنے بے بس ہیں ۔ بلکہ ریاستی عناصر نے ناپسندیدہ عناصر اور تخریبی قوتوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے پاکستان کو لمبے عرصے

کے لئے بدامنی کا اڈہ اور تخریبی عناصر کے لئے مستقل ٹھکانہ بنا ڈالا ہے۔ اور اب تو خطے کی دیگر قوتیں ایسے منصوبے بنا رہی ہیں کہ پاکستان کے ساتھ فوجی گٹھ جوڑ کے ذریعے مذکورہ بالا ممالک کو مزید لمبے عرصے تک بدامنی کے حوالے کر دیں۔

ایسے میں اگر ریاست نئے قسم کے حملوں اور قوانین کے ذریعے، یا ایک آدھ تخریب کار کو سزا دلوا کر اپنا امیج بہتر کرنے کی امید رکھے، اور وہ بھی ایسے حالات میں جبکہ تخریبی نیٹ ورکس کے ساتھ گفت وشنید بھی جاری ہو، تو ایسی امید یا تو ڈھٹائی پر محمول کی جاسکتی ہے، یا پھر ایسی اُمید انہی لوگوں کی ہوسکتی ہے جو بین الاقوامی سیاسی حلقوں کو بے وقوف سمجھتے ہیں۔ اس قسم کے نیم دلانہ، اور بعض اوقات چالاک قسم کے اقدامات سے بین الاقوامی سیاسی حلقوں کا یہ تاثر مزید پختہ ہوتا ہے کہ ''پاکستان ہمارے ساتھ چالاکیاں کرنے سے باز نہیں آتا۔''

اگر کسی ملک کے بارے میں اس قسم کا تاثر پختہ ہوتا جائے، تو پھر اس کی ایسی کوششوں کو بھی ملحوظ خاطر نہیں رکھا جاتا جو واقعی سنجیدگی سے کی جاتی ہیں۔ دوسری جانب یہ امید بھی دم توڑنے لگتی ہے کہ تخریبی قوتوں کے خلاف پاکستان سے تعاون بڑھانے سے کوئی افاقہ ہوگا۔

اب آیئے سرجیکل سٹرائیکس اور نئی سیکیورٹی پالیسی کی جانب حالیہ سرجیکل سٹرائیکس جہاں بھی ہوئے اور جس نوعیت کے بھی ہوئے، اس بارے میں تفصیلات کبھی سامنے نہیں آئیں۔ لیکن یہ پراپیگنڈہ ضرور ہوا کہ "طالبان کو ریاست کی سنجیدگی کے بارے میں بتا دیا گیا ہے۔ یا تو اب بات کرو، یا تیار رہو جاؤ نتائج کیلئے"۔ یہ بھلا کیا پالیسی ہوئی؟ اگر طالبان کو نتائج بھگتنے کا خوف دلایا جاسکتا ہے، تو پھر انہیں شکست کیوں نہیں دی جاسکتی؟ اس سوال کا جواب کون دے گا؟ کیا عالمی سیاسی حلقے یہ سوال کرتے ہیں؟ اگر کرتے ہیں تو ان کو جواب کیا ملتا ہے؟ اگر سوال نہیں کرتے، تو ظاہر ہے ان کا پاکستان کے بارے میں موجودہ امیج ہی قائم رہے گا۔ اور اگر جواب یہ دیا جاتا ہے کہ واقعی طالبان کو دھمکانے کیلئے یہ سٹرائیکس کئے گئے اور ان کا کل مقصد بس انہیں مذاکرات کی میز پر لانا تھا، اور یہ کہ ان کی جانب سے مذاکرات کیلئے جو نا قابل قبول شرائط سامنے آرہی تھیں، ان میں نرمی لانا مقصود تھا، تو بین الاقوامی سیاسی حلقوں میں پاکستان کا امیج پہلے سے بھی زیادہ خراب ہوگا۔ اس افسوسناک صورتحال کے دو پہلو ہیں۔ ایک جانب یہ احساس بڑھتا ہے کہ پاکستان تخریب کاری کے خاتمے کیلئے درکار قوت اور حوصلہ رکھتے ہوئے بھی، تخریبی قوتوں کو سری لنکا کی طرح نیست ونابود کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ دوسرا یہ کہ پاکستان کی تخریبی قوتوں کو غیر سرکاری فوج کے طور پر محفوظ رکھنے کی پالیسی نہیں بدلی، خواہ اس غیر سرکاری فوج کو وہ اپنے ملک ہی میں استعمال کرنا چاہے، یا پھر انہیں دیگر علاقوں اور ممالک میں منتقل کرنے کی کوشش کرے۔

اگر پہلا والا تاثر (یعنی اپنے ملک کے اندر ہی کم قیمت آپشن کا استعمال) زیادہ گہرا ہو، تو بین الاقوامی سیاسی حلقوں سے زیادہ پاکستانی سول سوسائٹی اور سیاسی حلقوں میں تشویش بڑھے گی۔ اور اگر دیگر ممالک میں تخریبی قوتوں کی ترسیل کا تاثر زیادہ گہرا ہو، تو امیج کی بہتری تو ایک جانب، یہ امیج پختہ ہوتا جائے گا کہ پاکستان تخریبی قوتوں کی برآمد سے باز نہیں آتا۔ ساتھ ہی ساتھ اندرون ملک یہ تاثر بھی تقویت پکڑتا جائے گا کہ پاکستان کو اس خطرناک ڈگر پر چلتے ہوئے ضرور بین الاقوامی پشت پناہی حاصل رہی ہوگی۔ ورنہ یہ خوف سے لرزتا، ناکام کہلانے والا ملک، اتنی بڑی گیم کھیلنے کا متحمل کیسے ہوسکتا ہے۔

پاکستانی امیج کے اس تجزیے میں آگے بڑھتے ہوئے اب آتے ہیں نئی سیکیورٹی پالیسی کی جانب۔ ایک تو یہ پالیسی بعد از خرابیٔ بسیار سامنے آئی ہے۔ دوسرا یہ کہ اس میں سنجیدگی کم اور ٹال مٹول زیادہ ہے، جو کہ بدنیتی کے تاثر کو مزید گہرا کرتی ہے۔ جیسے ہی آپ اس پالیسی کی چیدہ چیدہ شقوں پر نظر ڈالتے ہیں، آپ کو اندازہ ہونے لگتا ہے کہ اس پالیسی کے بنیادی اور پراپیگنڈہ والے پہلو تشکیل دینے سے پہلے اس کے مرتب کرنے والوں سے کہہ دیا گیا ہوگا کہ خبردار! یہ کسی بھی طور ایک نئی سیکورٹی پالیسی نہ لگے۔ اس نئی پالیسی سے یہ تاثر اُبھرتا ہے کہ اسے یا تو تخریب مخالف سیکیورٹی پالیسی کے بنیادی خدوخال پر نہیں ترتیب دیا گیا، یا پھر اس کے بنانے والوں نے معروف سلامتی پالیسیوں کا

سرے سے مطالعہ ہی نہیں کیا۔

جو نمایاں اقدامات اس پالیسی کے ذریعے تجویز کئے گئے وہ کچھ یوں ہیں: اس نوعیت کے آپریشن اور دیگر کارروائیاں ہوں گی کہ حکمت عملی کی سطح کے اہداف حاصل ہوسکیں: پولیس اور قانونی اداروں کی تشکیل نو، ملک کو اسلحہ سے پاک کرنا، مساجد اور مدارس کو ایک قومی (نگران) انتظامی دھارے میں لانا، تمام مخالف دھڑوں کے ساتھ تنازعات کا پرامن حل نکالنا، اظہار رائے کی آزادی، جمہوریت اور برداشت کے کلچر کا فروغ۔

مجھے خدشہ ہے کہ نئی سیکیورٹی پالیسی کے نام پر اس دستاویز کو وفاقی کابینہ سے منظور کروا کر اور پھر اس میں یہ شق ڈال کر کہ (قریباً اسی فیصد) منصوبے اور اقدامات خفیہ رہیں گے، پاکستان کے امیج کو دانستہ مزید خراب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بین الاقوامی سیاسی حلقوں میں سے ایک بھی ایسا بدبخت نکال کر دکھانا مشکل ہے، جو اس پالیسی میں سے کوئی افاقے کا پہلو نکال سکے۔ جتنی گہری چوٹ تخریب نے پاکستان کو لگائی ہے، اس پالیسی کی تہہ میں مقابلہ تن ایک فیصد بھی جوابی سنجیدگی نظر نہیں آتی۔

کیا مدارس، مساجد اور اسلحہ کے ضمن میں کارروائی بنیادی نوعیت کی ہوگی۔ اور اگر نہیں، تو کیا غیر بنیادی کارروائیاں کرتے ہوئے جب ریاست دہشت گردوں کے ساتھ مذاکرات کرتی نظر آئے گی تو کوئی بہتر امیج کما پائے گی۔ کیا گزشتہ سولہ سالوں سے پولیس اور قانونی اداروں کی اصلاح کے نام پر ریاست نے (اصلاحی فنڈز ہڑپ کرتے ہوئے) محض زبانی جمع خرچ جاری نہیں رکھا ہوا؟

اس پالیسی کے ذریعے ریاست نے پاکستانیوں اور دنیا کو واضح طور پر دو پیغامات دیئے ہیں۔ اوّل یہ کہ تخریب مخالف کام زیادہ تر خفیہ رکھنے کا ہے۔ دوم، تخریبی نیٹ ورکس کے سرپرستوں کے بارے میں کوئی راز افشا نہیں کیا جاسکتا۔ یہ پیغام پاکستان کا امیج مزید خراب کرنے کا تیر بہدف نسخہ ہے۔ بین الاقوامی سیاسی حلقوں کو احساس ہے، کہ اصل اقدامات سے فرار اختیار کیا جارہا ہے۔ تخریبی نیٹ ورکس کی پشت پناہ قوتوں کو تخریبی سرگرمی کے لئے استعمال ہونے والے سماجی عناصر سے علیحدہ کرنے کے بارے میں اس پالیسی میں کچھ نہیں۔ اگر ریاست سنجیدہ ہو، تو آغاز اندرونی و بیرونی پالیسیوں کی تبدیلی سے ہوتا ہے۔ یعنی ایسی پالیسیوں کا خاتمہ جن کے تحت پاکستان پراکسی وار کا اڈہ بنا۔ ان ممالک سے پراکسی وار کے لئے فنڈز کا حصول ترک کرنا، جنہیں آپ کہیں ''اور دو''۔ جواب میں وہ کہیں ''اور آگے بڑھو''۔ بنیادی تبدیلی اگر سیکیورٹی پالیسی کا مرکزی نکتہ بن جائے تو تخریبی نیٹ ورکس کی کمر ٹوٹ سکتی ہے۔ ایسی پالیسی روبہ عمل ہوجائے تو پولیس ان مساجد و مدارس میں سلیپنگ سیلز کا تانا بانا خود ہی مسمار کردے گی، جو تخریبی سپاہیوں کی قیام گاہیں اور کمین گاہیں بنتے ہیں۔ اس نئی پالیسی سے ایسا کوئی تاثر نہیں ابھرتا کہ تخریبی نیٹ ورکس کے پشت پناہوں کے بارے میں پاکستان کا بنیادی رویہ بدلے گا۔ ریاست میں گہری جڑیں بناتے ہوئے ان عناصر کو ریاستی ڈھانچے سے الگ نہیں کیا جا رہا۔ یہی وہ تصور ہے، جو نئی سیکورٹی پالیسی کی تہہ میں کارفرما نظر آتا ہے۔ لہٰذا یہ پالیسی امیج کی بہتری کی نہیں بلکہ مزید خراب کرنے کی سعی ہے۔ اور سب سے زیادہ خطرناک وہ ڈھٹائی ہے جو امیج کی بہتری کیلئے اقدامات کرنے سے انکار کی صورت میں سامنے آئی ہے۔

مصنف نے اپنے ۳۵ سالہ صحافیانہ کیریئر کے دوران کاؤنٹر ٹیررازم ٹیکس رپورٹنگ اور دیگر اقتصادی و سیاسی موضوعات پر کام کیا۔
اس میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے:
info@individualland.com

اشتہارات اور خواتین

سندس سیدہ

میڈیا کا کام ویسے تو ہمیں معاشرتی بیماریوں سے آگاہ کرنا ہے۔لیکن آج کل ٹیلی ویژن پر نظر دوڑائیں،تو خواتین کو نیچا دکھانے کی کوشش تواتر سے کی جارہی ہے۔ اُن کی عزتِ نفس مجروح کی جارہی ہے۔آپ کسی بھی چینل پر نظر دوڑائیں،کسی اخبار کا صفحہ پلٹیں،کوئی چیز آپ کی توجہ حاصل کرے نہ کرے، مختلف اشتہارات میں اپنی نمائش کرتی ماڈلز آپ کو ایک لمحے کو رک کر اشتہار دیکھنے پر مجبور کردیتی ہیں۔

مارکیٹنگ کے ذریعے اشیاء کی تشہیر کا مقصد شاید مصنوعات کی فروخت ہی نہیں، بلکہ اس کے ذریعے ہمیں زندگی گزارنے کے اطوار بھی سکھانا ہے۔ ویسے تو اشتہارات کا مقصد خریدار کو متوجہ کرنا ہوتا ہے، اور اگر خریدار مرد ہوں، تو ان کو متوجہ کرنے کے لیے خواتین کی موجودگی لازم گردانی جاتی ہے۔اشتہار کسی بھی چیز کا ہو،خوبرو ماڈلز کی غیر ضروری موجودگی اشتہارات کا حصہ بنتی جارہی ہے۔موٹر سائیکل ، جوس، ریفریجریٹر، یا سیفٹی ریزر کا اشتہار کیوں نا ہو،لڑکی کی موجودگی اہم ہے۔ ریفریجریٹر کے اشتہار کو ہی دیکھ لیجئے ۔ایک خوبصورت ماڈل ریفریجریٹر کے پاس کھڑی دکھائی جاتی ہے۔کیا ان کی جانب سے دیا گیا اتنا پیغام کافی نہیں ہوتا ،کہ لوڈ شیڈنگ جیسے سنگین مسئلے کا حلیہ ریفریجریٹر کے؟ اشتہارات بنانے والی کمپنیوں کو یہ مدِ نظر رکھنا چاہیے، کہ وہ جن مصنوعات کے اشتہارات بنا رہے ہیں،ان کا خریدار کون ہے۔ریفریجریٹر کا اشتہار ہے تو اس کے خریدار خاندان والے لوگ بھی ہیں۔اور خواتین ماڈلز کی موجودگی غیر ضروری ہے۔

جوس کے اشتہارات لے لیجئے۔میرے خیال میں ایک عام جوس، جو نوجوان، بچے اور بوڑھے سب کے لیے ہے، کے اشتہار میں عورت کی موجودگی ضروری نہیں اور صنفِ نازک کا استعمال محض نمائش کے لیے کیا جارہا ہے۔عورت کو نمائش کے لیے استعمال کرنا اشتہارات کا مقصد بنتا جارہا ہے۔یہی نہیں، آئے دن کوئی نہ کوئی رنگ گورا کرنے والی کریم آجاتی ہے اور پھر اس کی تشہیر کے لیے کالا اور سانولا رنگ رکھنے والی لڑکی کی حیثیت کمتر دکھائی جاتی ہے۔کہیں مردوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے رنگ گورا کرنے والی کریم کا استعمال کرتی لڑکی دکھائی جاتی ہے،تو کہیں یہ رنگ ہی اس کا رشتہ نہ ہونے کی وجہ بتایا جاتا ہے۔کیا سانولی یا کالی خواتین کی حیثیت ہماری نظر میں کچھ نہیں رہی؟ کیا عورت کا سجنا سنورنا اور خوبصورت لگنا اس لیے ہے کہ وہ مردوں کی توجہ حاصل کرے؟ ہم

نوجوانوں کو کیا ترغیب دے رہے ہیں؟ کیا ہم پر درست الزام لگایا جاتا ہے کہ ہم سیاہ فام لوگوں سے متعصب رویہ رکھتے ہیں؟ ہم اس الزام کو سچ ثابت کرنے کی کوشش کیوں کرتے ہیں؟

کسی بھی پروگرام کے دوران اشتہارات کی اتنی بھرمار ہوتی ہے۔ گویا ڈراموں کے درمیان اشتہارات نہیں دکھائے جاتے بلکہ اشتہارات میں کبھی کبھار ڈرامہ بھی دکھایا جاتا ہے۔ آج کل دکھائے جانے والے ڈراموں کے حالات بھی کچھ ایسے ہی ہیں۔ کہیں روتی پیٹتی عورتیں نظر آرہی ہیں، کہیں ظالم عورت ہے تو کہیں دغا باز، اور سازشی عورتیں۔ ویسے تو مردوں سے پٹتی اور ظلم سہتی عورت اب بہت سمجھدار ہو چکی ہے، لیکن اب بھی وہ چالاک مردوں کے جھانسے میں بہت آسانی سے آجاتی ہے۔ مرد جب چاہے اس کا استعمال کر لیتا ہے۔ ڈرامے اور خبریں دیکھ کر تو لگتا ہے، پاکستان میں خواتین یا تو ظلم کا شکار ہو رہی ہیں، یا دغا باز اور سازشی ہیں۔ زیادہ تر ڈرامے ایسے ہیں، جن میں یہ دکھایا جاتا ہے کہ دفاتر میں کام کرنے والی خواتین کے پاس، اپنے بچوں اور خاندان کے لیے کوئی وقت نہیں۔ وہ صبح دفتر میں کام کرتی ہیں اور شام کو پارٹیوں میں جاتی ہیں۔ ان کے گھر والے تک اس بات سے آگاہ نہیں ہوتے، کہ وہ کہاں جا رہی ہیں اور کیا کر رہی ہیں۔ جبکہ حقیقت اس سے یکسر مختلف ہے، میں بھی نوکری پیشہ خواتین میں شمار ہوتی ہوں، لیکن میرے گھر والوں کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں کب، کہاں جا رہی ہوں۔ رہی بات گھر والوں کو وقت دینے کی، تو شام کی چائے سے لے کر صبح کے ناشتے تک کا وقت، گھر والوں کے ساتھ گزارنا اور گھر کے مشاغل میں حصہ لینا بھی میرے معمول میں شامل ہے۔ گھر بار سے دور نوکری کرتی اور ظلم و ستم سہتی لڑکیاں دکھانا، ڈراموں میں عام ہوتا جا رہا ہے۔ یہ ڈرامے ان خواتین کی نمائندگی کیوں نہیں کرتے، جو گھریلو زندگی گزار رہی ہیں؟

یہاں میں ایک ڈرامے کی مثال دینا چاہوں گی۔ ایک شادی شدہ لڑکی کو اس کا شوہر اس شک پر طلاق دے دیتا ہے کہ اس کی بیوی اس کے بھائی کی محبوبہ ہے۔ جبکہ وہ یہ جانتا ہے کہ اس کے بھائی سے منگنی کو رد کرنے کے لیے ہی، اس کی بیوی نے خودکشی کی کوشش کی تھی، اور اس کے بعد اس سے بیاہی گئی تھی۔ اب

طلاق کا داغ لگنے کے بعد لڑکی کا بھائی صاف الفاظ میں کہہ دیتا ہے، کہ اب ماں باپ کے گھر میں بھی اس کے لئے جگہ نہیں، اور یہی حالات اس لڑکی کو دوبارہ اسی گھر میں لے جاتے ہیں، جہاں سے وہ طلاق دے کر نکال دی گئی تھی، یعنی اپنے اسی دیور کے ساتھ بیاہ کر اسی گھر میں دوبارہ چلی جاتی ہے، جس سے پہلے اس نے منگنی کرنے سے انکار کیا۔ اور خودکشی کی کوشش کی۔

کیا ہمارے ملک میں ایسا عام طور پر ہوتا ہے، کہ ایک دفعہ شادی کے بعد عورت پر اگر برا وقت آجائے، تو بھائی گھر کے دروازے بند کر دیتے ہیں؟ کیا ہمارے ملک میں طلاق لے لینا اور دوسری شادی کرنا بہت آسان ہو چکا ہے؟ کیا ایک عورت طلاق کا بدلہ لینے جیسے منفی احساس کے تحت، اپنی تمام زندگی اسی تلخ احساس کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور ہوتی ہے؟

اکثر ڈراموں میں یہ دکھایا جاتا ہے، کہ جب عورت گھر سے باہر نکلتی ہے، تو بُری نگاہیں اس کا تعاقب کرتی ہیں۔ وہ دفتر میں کام کرتی ہے تو ہراساں کی جاتی ہے۔ وہ گھر میں ہے تو شوہر، باپ، بھائی کے تشدد کا نشانہ بن رہی ہے۔ عورت کی عزت نفس مجروح کرنے کا کوئی موقع میڈیا ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ پاکستان کی ایک عام عورت کہاں ہے، جو دفتر آتی ہے تو اس کو کوئی مشکل نہیں ہوتی۔ وہ گھر پر ہے تو ایک پرسکون زندگی گزارتی ہے۔ کوئی بھی عورت میڈیا کی نظر میں تبھی کیوں آتی ہے جب اس کے ساتھ کوئی ظلم ہو؟ کیا عورت کے ساتھ ظلم و زیادتی کو میڈیا اپنی دھونس اور ریٹنگ بڑھانے کے لیے استعمال کر رہا ہے؟ اگر کوئی ظلم و زیادتی کی خبر نہ ملے، تو عورت میڈیا کے لیے فالتو سامان کی طرح ہے، جس کی موجودگی کا احساس بھی نہیں ہو پاتا۔ جب ضرورت پڑی، اپنا مطلب نکال لیا۔ یہ ڈرامے اور اشتہارات، گھریلو اور عام خواتین ملازمین کو کیوں نہیں دکھاتے؟

صرف یہی نہیں، عورت پر ظلم کی داستانیں صرف میڈیا پر بکتی نظر نہیں آتیں، بلکہ ہر کوئی اپنے مطلب کے لیے مظلوم عورت کے کندھے پر رکھ کر بندوق چلاتا نظر آتا ہے۔ بات ہو پاکستان کی، اور دہشتگردی اور دہشتگردوں کا ذکر نہ ہو؟ ان درندہ صفت لوگوں نے سینکڑوں لوگوں کی جانیں لی ہیں، لیکن نہ جانے وہ کہاں سے تین سو قیدی عورتوں اور بچوں کی فہرست لے آئے، جن پر حکومت کو خاص طور پر رحم آ گیا ہے۔ انہوں نے طوفان کا رخ اپنی جانب سے موڑنے کے لیے، ان کی مظلوم، روتی پیٹتی، تباہ حال خواتین کا سہارا لیا، جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ خود اپنا بوجھ نہیں اٹھا سکتیں۔ خواتین کی اہمیت کا اندازہ اسی بات سے لگا لیجئے، کہ مختلف کالعدم تنظیمیں خواتین کے لیے باقاعدہ رسالے اور پیغامات ترتیب دیتی ہیں۔

آپ میری رائے سے اتفاق کریں یا نہ کریں، میں یہی کہوں گی، کہ عورت کے بغیر کسی چیز کی کوئی اہمیت نہیں۔ عورت کے بغیر یہ دنیا ادھوری ہے۔ ہمارا میڈیا اسی چیز کی دوکان سجا کے بیٹھا ہے، جو ہم دیکھنا چاہتے ہیں۔ عورت کہیں بھی روتی پیٹتی، ہمدردیاں سمیٹتی ہو، وہ ہمارے میڈیا کی خوردبین نگاہوں سے نہیں بچ سکتی۔ کاش ہم ایک عام عورت کی کہانی چلانا بھی سیکھ لیں، جو ظلم اور تشدد کی داستانوں سے پاک ہو۔ وہ سازشی، دغاباز اور عیاش نہ ہو، بلکہ میری اور آپ جیسی کئی خواتین کی طرح ایک عام زندگی گزار رہی ہو۔ یا ان خواتین کی طرح، جنہیں میں اور آپ جانتے ہیں۔ یہ صورتحال صرف ہمارے ملک میں نہیں، بلکہ پوری دنیا میں یہی ہوتا ہے۔

عورت سے متعلق خبریں ہاتھوں ہاتھ بکتی ہیں۔ اور اگر داستانیں ہوں اس کو نیچا دکھانے کی، اور اس پر ڈھائے جانے والے مظالم کی، تو تیل کا کام کرتی ہیں۔ دوسری جانب بناوٹ کی بلندیوں کو چھوتی عورت دکھائی جاتی ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ عورت کی ہر ادا میڈیا پر بکتی نظر آتی ہے، تو غلط نہ ہوگا۔

مصنفہ انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں ایک ریسرچ آفیسر کی حیثیت سے کام کر رہی ہیں اور فردرسالے کی ایڈیٹر بھی ہیں۔
میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے
info@individualland.com

ایک مسجد سب کے لئے

ریحان علی

آج پاکستان پہلے سے کہیں زیادہ مصائب میں گھرا ہوا ہے۔فرقہ وارانہ مار دھاڑ زوروں پر ہے۔ایک فرقہ کی دوسرے پر انتہا پسندی میں سبقت لے جانے کی جدوجہد معمول بن چکی ہے،اور اس عمل میں مختلف فرقوں کے رہنماؤں کو قتل کیا جارہا ہے۔

پاکستان میں گذشتہ چند سالوں میں مذہبی عدم برداشت خطرناک حد سے تجاوز کرچکی ہے۔اس کے مظاہر میں عیسائیوں کے ساتھ بربریت اوران کے چرچز پر حملوں سے لیکر احمدیوں کی لاہور میں عبادت گاہوں کی بے حرمتی اور سابق گورنر سلمان تاثیر کا توہین مذہب کے بہتان کے تحت قتل نمایاں ہیں۔

شیعہ ہزارہ برادری مظلومیت کی ایک روح فرسا تصویر بنے ہوئے ہیں۔ان پر گذشتہ دو سالوں میں بلوچستان میں کئی حملے کئے گئے۔ بدقسمتی سے ایسی برادریوں اوراقلیتوں کے حقوق اور جان و مال کے تحفظ کے لئے کوئی اقدامات نہیں اٹھائے گئے۔

عدم برداشت ہمارے رویوں میں کچھ اس طرح رچ بس چکی ہے کہ ہم حواس پر قابو نہیں پاتے جب ہماری کہیں بحث ہوجائے۔حتٰی کہ ٹیلی ویژن پر ٹاک شوز کے شرکاء عموماً موضوع بحث کو چھوڑ کر ذاتی حملوں پر اُتر آتے ہیں،اور نتیجتاً بحث تنازعے میں بدل کر یہ اشارہ دیتی ہے کہ ہم لوگ کتنے آتش مزاج ہیں۔یہیں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ہمارا سماج کس قدر خوفناک عدم برداشت میں دھنس چکا ہے،اور مذہبی منافرت اور ملائیت نے جناح کے پاکستان کو کس قدر مسخر کرلیا ہے۔

انتہا پسندی اس سماج میں مرض کی طرح پھیل چکی ہے،اور جو لوگ اسے منظم طریقے سے فروغ دے رہے ہیں،انہیں شاید انتہا پسندی اور فرقہ واریت کے ایجنڈے پر چل کر کوئی فائدہ ہوتا ہو۔لیکن سماج کے لئے یہ عمل ناسور بن چکا ہے۔اسی ماحول میں، جبکہ بین المذاہبی منافرت زوروں پر ہے،ایک بزنس مین، زاہد اقبال نے مارگلہ کے دامن میں دارالایمان جامع مسجد قرطبہ کے نام سے ایک عمارت کھڑی کردی ہے۔اس مسجد کی انفرادیت یہ ہے کہ یہ پاکستان میں پہلی فرقہ وارانہ تقسیم سے پاک مقاصد کے لئے ایک پہلی کوشش ہے۔یہاں کسی بھی فرقے کے افراد کا بلاتفریق عبادت کے لئے خیر مقدم ہوتا ہے۔مسجد کا عملہ دانشوروں پر مبنی ہے، جس سے تبدیلی کی امید مزید بڑھتی ہے۔قاری جہانگیر مسجد کے امام ہیں، جوان دنوں اسلامی یونیورسٹی کی ماسٹر ڈگری کے لئے حصول علم میں مصروف ہیں۔مسجد کے معاون (کوآرڈی نیٹر) پریسٹن یونیورسٹی میں ایم بی اے کے طالب علم ہیں۔مزید حوصلہ افزاء پہلو یہ ہے کہ امام اور معاون مختلف فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ یوں اس مسجد نے ہم آہنگی اور برداشت کی ایک سنہری مثال رقم کی ہے۔زاہد اقبال کے بقول "مسجد کے مقدس ادارے کے ذریعے مذہب کو ملاؤں نے ذاتی مفاد کے لئے تجارتی مراکز میں تبدیل کردیا ہے"۔انہوں نے مزید کہا" یہ خدا کا گھر ہے،اور غیر مسلموں کو بھی یہاں عبادت کی دعوت ہے"۔

اس مسجد میں خواتین کے لئے الگ سیکشن بنایا گیا ہے۔اس کے علاوہ مذہبی کتب سے لبریز ایک لائبریری ہے، جس میں مختلف فرقوں کے لئے تحاریر کی دستیابی کو یقینی بنایا گیا ہے۔اس عدم فرقہ مسجد کی تعمیر مختلف مکاتب فکر، اور بین المذاہبی ہم آہنگی کے لئے ،ایک یگانہ کوشش ہے۔اس اقدام کی جتنی تعریف کی جائے، کم ہے۔ تاہم زاہد اقبال صاحب کو اس منصوبے کی تکمیل میں پے در پے دشواریوں کا سامنا رہا۔ مقامی مسجد کے امام نے انہیں اس منصوبے سے باز رکھنے کی حتی الوسع کوششیں کیں۔ یہاں تک کہ مدرسوں کے طلباء کے ذریعے اس قطعہ اراضی پر قبضہ کروادیا، جہاں یہ بے مثال مسجد تعمیر کی جانی تھی۔تاہم، پولیس کے ذریعے انہوں نے یہ قطعہ بڑی دشواریوں کے بعد واگزار کروالیا۔

ایسے تمام مصائب کے باوجود زاہد اقبال صاحب ایک ایسی عبادت گاہ کے قیام میں کامیاب ہوئے، جہاں مختلف فرقوں کے لوگ عبادت اور اپنی برادریوں کے مسائل کے بارے میں بے لاگ گفت وشنید کرتے ہیں۔اس کا قیام مذہبی تشدد کے خاتمے کی جانب پہلا قدم ثابت ہوسکتا ہے۔ایسا تب ہی ممکن ہے جب یہ پیغام بیانگ دہل عام کردیا جائے، کہ ہمارے دلوں سے نفرت کو نکال پھینکنا واقعی ممکن ہے۔

مذہبی منافرت کے خاتمے کے لئے اولین اقدام ہمارے تعلیمی اداروں کے نصاب سے متعلق پالیسی کا نئے سرے سے ترتیب دینا ہے۔سکولوں میں

پڑھائی جانے والی کتب میں موجود تعصّبات ہمارے طلباء و طالبات اور عام نوجوانوں کے ذہنوں کو خراب کرکے انہیں انتہا پسندی کی جانب دھکیلتے ہیں۔ اساتذہ کو علوم کی ترسیل کے ساتھ ساتھ، طلباء کو انسانی اقدار اور فرض شناس شہری کے فرائض سے بھی روشناس کرنا ہوگا۔سکولوں میں اقلیتوں کیخلاف تعصب بھری تعلیم، ان اداروں کو ایسی فیکٹریوں میں بدل دیتی ہے ،جہاں اقلیتوں کو "دشمن" قرار دے کر ہمارے بچوں کو انتہا پسند بنایا جاتا ہے۔ یہ صورت حال تقاضا کرتی ہے، کہ تعصّباتی پراپیگنڈہ کے خلاف عوامی شعور بیدار کیا جائے۔اسی سے ہمارے سماج میں فلاح کو فروغ ہوگا، اور ہم جناح کے پاکستان کو، نفرت اور فرقہ واریت پھیلانے والوں سے چھین سکیں گے۔

مصنف انڈیویجوئل لینڈ پاکستان میں کمیونیکیشن آفیسر کی حیثیت سے کام کررہے ہیں۔
میگزین یا مضمون سے متعلق مزید معلومات کے لئے رابطہ کیجئے
info@individualland.com

شکیبیاں

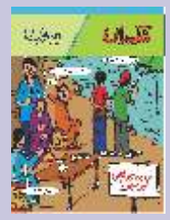

حکومت اور احتساب

نوجوانوں سے متعلق

ادارے سے آگاہی

انڈویجوئل لینڈ پاکستان ایک متحرک، غیر جماعتی اور غیر منافع بخش رجسٹرڈ سول سوسائٹی ادارہ ہے۔اس کا بورڈ کل پانچ ارکان پر مشتمل ہے، جبکہ روزمرہ کے معاملات اس ادارے کے ڈائریکٹر کی ذمہ داری ہے۔ قیام سے لے کر آج تک اس ادارے نے حکومتی انتظامات، قانون کی بالادستی، میڈیا اور مراسلاتی، ہنر، سول سوسائٹی کے استحکام اور جمہوریت کی ترقی کے لئے کام کیا ہے۔

انڈویجوئل لینڈ نے واضح طور پر قانون دانوں اور دیگر سول سوسائٹی اداروں کے ساتھ مختلف حیثیتوں میں کام کیا ہے اور خصوصاً میڈیا سے تعلق رکھنے والے افراد کی تربیت کے حوالے سے اس کا نام پورے پاکستان میں جانا جاتا ہے۔

اشاعت

میڈیا سے متعلق

تنازعاتی تجزیے اور انتہا پسندی کے خاتمے سے متعلق

فرد میگزین

پاکستان پولیس خواتین

اگلی اشاعت اکتوبر ۲۰۱۴ میں

Find us
Individualland
Individualland